کی زندگی کی ناہمواری اور کجی کی عکاسی مؤثر اور عبرتناک انداز میں کی گئی ہے اور مذہبی و سیاسی لوگوں کے قول و عمل میں تضاد، مکر و فریب، داؤں پیچ اور ریا و نمود کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، انھوں نے حالات کے گھناؤنے پن ہی کو دکھانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کا انسانی ہمدردی سے معمور دل ان پر اپنے کرب کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ مجموعہ مصنف کی نظر ثانی کے بغیر شائع ہوا ہے اس لئے اس میں کہیں کہیں زبان و طریقہ ادا کی خامیاں بھی ہیں، تاہم اس میں ظاہر کئے گئے خیالات و جذبات نیک ہیں، مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی یہ ادب نوازی لائق تحسین ہے۔

جنوبی ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر) مرتبہ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۲۶، قیمت غیر مجلد ۱۵ روپے، لائبریری اڈیشن ۱۸ روپیے، پتے: (۱) بک ڈپو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد دکن، (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو صحافت پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انہیں جنوبی ہند کی قدیم صحافت پر کم لکھا گیا ہے اس کتاب میں وہاں کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو صحافت کا ذکر ہے، پہلے صحافت کی اہمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں اسکی ابتدا کا ذکر اور ہندوستان و جنوبی ہند میں انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں صحافت کا آغاز اور ہندوستان کے فارسی اخبارات کا تذکرہ ہے، اسکے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز، اس زمانہ کے اخبار اور مختلف جگہوں میں اردو صحافت کی روداد قلمبند کی ہے، پھر جنوبی ہند میں اردو صحافت کی ابتدا اور مدراس سے شائع ہونے والے پندرہ اردو اخباروں کے متعلق معلومات درج ہیں، اسمیں ۱۸۵۷ء کے بعد کے دو اخباروں کا ذکر بھی اس لئے آگیا ہے کہ ان کے سنہ اشاعت کے بارہ میں غلط بیانی کی گئی تھی۔ مصنف نے ہر اخبار کے بارہ میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں اور اڈیٹر کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، آخر میں جنوبی ہند کے ۱۸۵۷ء سے قبل کے اردو مطابع اور انکی خدمات و مطبوعات کا تذکرہ ہے، مصنف نے منتشر مواد کو سلیقہ اور محنت سے جمع کرکے اس پر اضافہ بھی کیا ہے، اور بعض غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے، مگر اجرا کے بجائے کئی جگہ اجرائی لکھا ہے جو کھٹکتا ہے، "ض"

جلد ۱۳۴ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات

گذشتہ مہینے کے شذرات میں ہندوستان کے نامور مورخ جدوناتھ سرکار کی تاریخ نویسی کی نوعیت کا ذکر آیا تھا، ان کی مورخانہ حیثیت کا جائزہ کچھ اور زاویۂ نگاہ سے لینے کی ضرورت ہے۔

وہ اس ملک کے مغل حکمرانوں کے عہد اور خصوصاً عالمگیریات کے بڑے مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں، ان کی ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچ جلدوں، سیواجی پر ایک جلد اور فال آف دی موغل امپائر کی چار جلدوں کی بڑی شہرت ہوئی، ان کو ان تحقیقی خدمات کے صلہ میں بڑے اعزاز حاصل ہوئے، برطانوی حکومت کی طرف سے سر کا بھی خطاب ملا، ان کتابوں میں ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کو پڑھتے وقت یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں بڑی معروضیت اور حقیقت پسندی ہے جس کو تسلیم کئے بغیر کوئی اور چارہ نہیں، اس اثر کے پیدا کرنے میں ان کی تحریر کی روانی اور برجستگی اور پھر زور بیان کے ساتھ ان کے طرز استدلالات، مغالطہ آمیز معلولات اور تعبیرات بہت زیادہ معاون ہوئیں، لیکن ان دسوں جلدوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ یہ یا تو انگریزوں کے اشارے سے یا ان کی خوشنودی کی خاطر لکھی گئیں۔

انگریزوں نے مغلوں کی حکومت کو ختم کرکے اس ملک پر اپنا غاصبانہ تسلط قائم کیا تو اس پر پردہ ڈالنے کی خاطر ان کی خواہش ہوئی کہ مغلوں کی حکمرانی کی بہت ہی بھیانک تصویر پیش کی جائے، اس کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف ان کے حکمرانوں بلکہ ان کے مذہب کی بھی زیادہ سے زیادہ بڑی مرقع آرائی کی جائے، پھر انگریزوں کے ورود کو مسعود ثابت کرنے کے لئے اس زمانے کے ملک کی بدحالی، ابتری اور انتشار پسندی کا نقشہ بھی ایسا پیش کیا جائے کہ برطانوی حکومت کو یہاں کے لوگ رحمتِ الٰہی سمجھنے پر مجبور کئے جائیں

مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں جو کام الیٹ اور ڈاوسن نے اپنی تاریخ ہند کی دس جلدوں میں

انجام دیا وہی جدوناتھ سرکار دوسرے انداز میں اپنی مذکورۂ بالا دس جلدوں میں انجام دے کر انگریزوں سے خراج عقیدت حاصل کرتے رہے، انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کے ۳۴ ویں باب میں ایک عنوان اسلامک اسٹیٹ چرچ ان انڈیا کے نام سے قائم کیا جس میں لکھتے ہیں کہ کسی فرقہ کے ساتھ رواداری کا اظہار کرنا مسلم ریاست میں گناہ سمجھا جاتا ہے، مسلم ریاست کا یہ نصب العین رہا ہے کہ ساری آبادی سے اسلام قبول کرا دیا جائے، اور جو انکار کرے اس کو ختم کر دیا جائے، غیر مسلم اسلامی حکومت کے شہری نہیں سمجھے جاتے ہیں، وہ اچھا لباس نہیں پہن سکتے نہ گھوڑے کی سواری کر سکتے، نہ اسلحہ رکھ سکتے، اس سلسلہ میں یہ بھی لکھ گئے ہیں، جیسا کہ گذشتہ ماہ کے شذرات میں ذکر آیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے۔ وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیرووں کی ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کافر کشی ایک مسلمان کے لئے وصف کہا جاتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے، برائیوں کو دور کرے، یہ بھی اس کے لئے ضروری نہیں کہ اپنے میں زیادہ سے زیادہ روحانیت پیدا کرے، وہ اپنے انسانی ساتھیوں کے ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو قتل کر دے، ان کی دولت اور زمین کو لوٹ لے، تو بس اس کی روح بہشت کی مستحق ہو جائے گی، (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۵۹)

ایسی بے بنیاد اشتعال انگیز اور زہریلی تحریر اسلام کا انتہائی درجہ کا معاندہی لکھ سکتا ہے، مسلمانوں یعنی مغلوں کی حکومت کی مذمت جس طرح کی ہے، اس کا ذکر بھی گذشتہ مہینے کے شذرات میں آیا ہے، وہ مغلوں کے امپائر کو قزاقی کہتے ہیں، ان کو جا بجا غیر ملکی، حملہ آور اور سامراجی قوت کہہ کر یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ان کی نسل مفتوحین سے فیاضی اور صنف نازک سے فیاضانہ بہادری دکھانا نہیں جانتی تھی (اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۷)

اور چونکہ مسلمان اورنگ زیب کو ایک اچھا حکمراں سمجھتے ہیں اس لئے جدوناتھ سرکار نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایسا بدترین حکمراں ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ کوئی اور بدتر تصور نہیں کیا جاسکتا

ہے (اسٹڈیز ان موغل انڈیا ص ۶۲-۶۰) اس کو راون (اورنگ زیب ج ۳ ص ۸۳) ظالم (ایضاً ج ۳ ص ۱۳۶) جھوٹا اور دغاباز (ایضاً ج ۲ ص ۹۴) سنگ دل اور ضمیر کو خلی (ایضاً ج ۱ ص ۱۰۰) ہر شرمناک واقعہ سے فائدہ اٹھانے والا (ایضاً ج ۱ ص ۶۵) اپنی جنسی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہوجانے والا (ایضاً ص ۶۶) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور شروع سے آخر تک یہ اثر پیدا کیا ہے کہ اس نے پچاس برس تک اس لئے حکومت کی کہ وہ قرآنی سیاست کے مطابق ہندوؤں کی زندگی کو ناقابل برداشت بنادے، ان کو نیچا دکھائے ان کو حکومتوں کی ملازمتوں سے محروم کردے، وہ معاشرتی ارتباط سے ناآشنا ہوکر زندگی بسر کریں (ایضاً ج ۵ ص ۴۸۵) ان کے مندروں کو منہدم کرتا رہے، ان کے علوم و فنون کو برباد کردے، راجپوتوں کی حب الوطنی کو کچل کر رکھ دے، فادر لینڈ کی محبت میں لڑنے اور ہندوئی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں کو تہس نہس کردے

اورنگ زیب پر جو پانچ جلدیں ہیں، ان میں تو جدوناتھ سرکار نے یہ دکھایا ہے کہ اس کے خلاف مرہٹوں کی جنگ نیشنلزم کی تھی، انھوں نے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا، اور اپنے فادر لینڈ کو غیر ملکیوں کے استبداد سے محفوظ کیا (اورنگ زیب ج ۱ ص ۱۲) اور پھر یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ راجپوت حب الوطنی کے جذبے میں لڑتے رہے، تاکہ وہ غیر ملکیوں کی حکومت سے آزاد ہوں اور اپنے ہی راجاؤں کے ماتحت رہیں، اپنی سرزمین کو گنگا کے پانی اور تلسی کی پتیوں سے دھوئیں (ج ۵ ص ۲۹۲) مگر فال آف دی موغل امپائر کی چاروں جلدوں میں یہی مرہٹے اور راجپوت کچھ اور نظر آتے ہیں،

ان چاروں جلدوں میں مرہٹوں کی سرگرمیاں جہاں بہت کچھ لکھی گئی ہیں، وہاں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نواب علی وردی خاں کی جہاں حکومت باقی نہیں تھی، وہاں مرہٹے غارت گروں نے سڑکوں اور گاؤں میں ناقابل برداشت مظالم کئے، اور ان کی سفاکی سے پورے بنگال میں بڑی مصیبت رہی، لوگوں سے چاندی اور سونا چھین کر ان کے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ دیتے، عورتوں کے ساتھ ہر قسم کا جرم کرتے، مندروں میں آگ لگا دیتے، کچھ لوگوں کو پٹک کر جوتوں سے مارتے، ان کا نعرہ ہوتا روپے دو روپے دو، اگر روپے نہیں ملتے تو

لوگوں کی ناکوں میں پانی بھر دیتے، یا حبس دم کرکے مار ڈالتے (فال: ج ۱ ص ۵۰-۴۹)

فادر لینڈ میں ہندوئی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں نے راجپوتانہ میں جو غارت گری کی، اس پر مختلف ابواب میں تبصرہ کرنے کے بعد جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ راجپوتانہ میں مرہٹوں کی سرگرمیاں چالیس برس تک یعنی ۱۷۰۵ء سے ۱۸۴۵ء تک ایسی رہیں کہ راجپوتوں کے دلوں میں ان کے خلاف ایسی نفرت پیدا ہوئی جو اب تک ختم نہیں ہوئی ہے (ایضاً ج ۲ ص ۲۶۲) اسی نفرت کی بدولت پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی شکست فاش پر راجپوت خوش تھے، جدوناتھ سرکار کا یہ بھی بیان ہے کہ اس شکست کے بعد دکنی تسلط کے خلاف ہر طرف بغاوت تھی، گنگا کے دوآب، بندھیل کھنڈ، راجپوتانہ اور مالوہ میں ان کے خلاف شورش تھی (ایضاً ج ۲ ص ۳۶۹) بے پور کے مادھو سنگھ نے تو اس زمانہ کے مسلمان امراء نجف اور یعقوب علی، اور بھوپال، کوٹا اور کچھی کے راجپوت راجاؤں سے مل کر مرہٹوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی، اور شاہ عالم کو ایک مضبوط حکمراں بنانا چاہا، لیکن یہ سعی زیادہ کارگر نہیں ہوسکی، خود جدوناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ ۱۷۷۱ء میں مہادجی سندھیا پہلی دفعہ شاہ عالم کے حضور میں حاضر ہوا تو تخت کے سامنے سجدہ میں گر پڑا اور اپنا سر شاہ عالم کے پاؤں پر رکھ دیا، یہ مغل بادشاہ مرہٹوں کی ساری غارت گری اور چیرہ دستی کو بھول گیا، اور اس کو اپنا فرزند بنالیا (فال ج ۳ ص ۲۳۱)

مرہٹوں کی اس کردار نگاری کے ساتھ جدوناتھ سرکار نے راجپوتوں کے کیرکٹر کی یہ تصویر کھینچی کہ ایک راجپوت زمین کی خاطر ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کرلیتا، باپ بیٹے، اور بیٹا باپ کو قتل کردیتا، شریف ترین خاندان کی عورتیں اپنے بہت ہی قابل اعتماد رشتہ داروں کو زہر دے دیتیں، راجہ اپنے وفادار وزیروں کی جانیں لے لیتے، اپنے خانگی جھگڑوں میں بیسرونی ڈاکو کی بھی مدد حاصل کرلیتے (فال ج ۱ ص ۱۳۱)، وہ یہ بھی لکھتے ہیں، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ اورنگ زیب نے سارے علاقے فتح کرلئے، ہر جگہ امن و امان قائم ہوگیا، کہیں لڑائی لڑنے کی ضرورت نہیں رہی، تو راجپوت بے روزگار

ہو گئے، پھر تو وہ اپنے رشتہ داروں ہی سے لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ ہو گئے، یا اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے لگے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۵۵ - ۳۵۴) محمد شاہ کے زوال کے زمانے سے راجپوتانہ میں انتشار، لوٹ مار، اقتصادی بربادی اور اخلاقی زبوں حالی انتہا درجہ کی رہی (فال ج ۴ ص ۳۰ - ۱۴۳) راجپوت راجا عیاشی میں مبتلا رہنے لگے، بکثرت بیویاں رکھنے کے باوجود داشتائیں بھی رکھنے کے عادی ہو گئے جو محل کی سازشوں میں شریک رہتیں، ان کی وجہ سے راجپوتوں میں تباہی اور بربادی آتی رہی، اور ان کا کیرکٹر برباد ہو کر رہ گیا (ایضاً ج ۴ ص ۲۰)

جدوناتھ سرکار نے اس زمانے کے جاٹوں کی غارت گری کی بھی پوری تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے آگرہ اور دہلی کو لوٹا، لاکھوں کی رقم لے گئے، عورتوں کی بے حرمتی کی، مکانات منہدم کر دیئے، وہ مرہٹوں اور راجپوتوں کے لئے بھی دردسر بن گئے، پھر ان سے عاجز آکر مرہٹے، راجپوت، روہیلے، اور اودھ کے لشکری آپس میں متحد ہو گئے، اور مغل بادشاہ شاہ عالم کی قوت کو مؤثر بنانے کی کوشش کی، تاکہ جاٹوں کی نوزائیدہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے، مگر یہ کوشش بھی بارآور نہیں ہوئی (فال ج ۲ ص ۵۱ - ۳۰۶)

اس زمانے کے سکھوں کے متعلق جدوناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے علاقے سے باہر نکل کر مرہٹوں کی طرح بلیک میل کرتے، جس طرح مرہٹے ملک گیری یا چوتھ وصول کرتے، اسی طرح وہ راکھی حاصل کرتے، اگر کوئی یہ راکھی دینے سے انکار کرتا تو اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑتا۔

جدوناتھ سرکار نے یہ ساری تفصیلات پھیلا کر فال آف دی مغل ایمپائر کی چار جلدوں میں لکھی ہیں، جن میں اپنی محنت، معروضیت اور حقیقت پسندی کا اظہار صرف یہ دکھلانے کے لئے کیا ہے کہ جب ملک میں ہر طرف پراگندگی، زبوں حالی، ابتری اور افراتفری تھی تو انگریز نمودار ہوئے، اور صحیح وقت پر ہوئے، لارڈ ولیلی کو اپنی تحریروں کے قلمی پردے پر بڑی خوش اسلوبی سے لائے ہیں، ان کے ہم صوبہ مؤرخ بی۔ ڈی۔ باسو نے اپنی

کتاب رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا میں لارڈ ولیلی کے سارے کرتوتوں کی تفصیل لکھ کر اس کو اپنے زمانہ کا میکاولی کہا ہے مگر جدوناتھ سرکار نے اس کی ایسی تعریف کی ہے جیسے مغلوں کے دربار کا کوئی مؤرخ اپنے شاہی آقا کی کرتا ہے اس کی حیرت انگیز ذکاوت اور کارکردگی اس کی مافوق الفطری بصیرت، اس کی تنظیمی قوت، اپنے مقصد اور کامیابی کی تکمیل میں غیر معمولی عجلت کے ساتھ اس کے عملی اقدام اور حاوی ہو جانے والی قوت ارادی کی مداحی دل کھول کر کی ہے، اس کی فوج کے جنرل لیک کی جنگی تیاری کی داد یہ لکھ کر دی ہے کہ ایسی ہی تیاری سے ایک معیار قائم ہوتا ہے (فال: ج ۴ ص ۶۸ - ۲۶۴)

وہ لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ سے گنگا تک کے علاقے میں عظیم انارکی تھی، انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی فتوحات کے بعد ہی ختم ہوئی، (فال: ج ۳ ص ۱۰۵) وہ خوش ہو کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ مغلوں کی حکومت قزاقی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا (فال ج ۱ ص ۱۵۰) انھوں نے اس پر بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ برطانوی حکومت مصیبت زدہ راجپوتوں کے زخموں کا پھایا بن گئی (فال: ج ۱ ص ۳۲ - ۱۳۱)

اور پھر انگریزوں کی حکومت کی مداحی کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکتا، لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت کی وجہ سے ہندوستان میں جو نشاۃ ثانیہ ہوئی، وہ دنیا کی تاریخ میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی، ہماری سوسائٹی مایوسی کی حد تک زوال پذیر ہو گئی تھی، لیکن اسی زمانے میں یورپ کی حقیقی ترقی پذیر اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ آپہونچی، سب سے پہلے ایک ایماندار اور کارگذار نظام سلطنت ملک میں قائم ہو گیا، جس سے امن بحال ہوا، اقتصادی ترقی ہوئی اور ہماری سوسائٹی کی خشک ہڈیوں میں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ساحروں کی چھڑی سے حرکت پیدا ہونے لگی، پچ مچ ایک ایسی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آگئی جو قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے گہری وسیع اور انقلابی تھی (فال: ج ۴ ص ۳۴۴)

جدوناتھ سرکار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس تک روشن خیالی کی حکومت رہی

(فال: ج ۴ ص ۲۴۳) ہندوستان کا سیاسی ارتقا برطانوی سامراجیت ہی کی بدولت ہوا (فال: ج ۲ ص ۳۵۰) اس ڈیڑھ سو برس میں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی بھی شہادت ہوئی، ۱۸۵۷ء کے رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات بھی پیش آئے، بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ان کی تفصیلات کو پڑھ کر آنکھوں سے خون کی بوندیں اب بھی ٹپک پڑتی ہیں، اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں اور حب الوطنی کے جذبے میں سرشار رہنے والے راجپوتوں کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈال دیئے گئے، ان سب کو جدوناتھ سرکار نظر انداز کر گئے۔

جدوناتھ سرکار کی زندگی ہی میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جلیانوالہ باغ کی ہولناکیاں بھی پیش آئیں گاندھی جی نے برطانوی حکومت کو شیطانی حکومت کہا، اس کے خلاف آزادی کی جنگ شروع ہوگئی جس میں ہندو مسلمان دونوں نے پوری جانبازی اور سرفروشی سے کام لیا، وہ جیل گئے، ان کے پیچھے مجمع کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا ان سب کو پس پشت ڈال کر جدوناتھ سرکار مرہٹوں، راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں، اور مغلوں کو انتشار پسند تخریب کار لٹیرے، بدکار، نالائق اور عیاش قرار دے کر انگریزوں کو ایک ایماندار اور کارگذار نظام سلطنت کا بانی اپنی قوت سحر سے ہندوستان کے اندر ایک نئی روح پھونکنے والے اور اپنی ساحرانہ چھڑیوں سے نشاۃ ثانیہ کا پیام لانے والے ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے ان کے بعد وہ سر جدوناتھ سرکار کیوں نہیں ہوتے، مگر اب ہم کو آپ کو یہ غور کرنا ہے کہ انھوں نے محب وطن مورخ بن کر اپنے ملک کی تاریخ کو سنوارا ہے، یا خاص اغراض کی تکمیل کی خاطر اس کو بگاڑا ہے، کیا ان کا تاریخی لٹریچر ہندوستان کی موجودہ جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی میں معاون ہو سکتا ہے،

معارف کے آئندہ شذرات میں جدوناتھ سرکار کی تحقیقات کی تضاد بیانی اور ان کی تحریروں کی شترگربگی پر تبصرہ ہوگا۔

مقالات

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از

ڈاکٹر نثار احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

(۳)

اعتراضات، الزامات، مفتریات وہفوات

مستشرقین کی جانب سے اسلام کے لئے بالعموم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بالخصوص جو طرز عمل اختیار کیا گیا، اس کا مختصر سا خاکہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اب جہاں تک سیرت رسول کے حوالے سے ان کے اعتراضات اور الزامات کا تعلق ہے، اس مختصر مقالہ میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اس لئے بھی ممکن نہیں کہ اعتراضات و الزامات کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مستشرقین کی تحریروں میں، اُن کے پیدا کردہ لٹریچر میں، اور اُن کے خرافات کے ذخیرہ میں بکثرت صدیوں سے پائے جاتے ہیں، ان کے ہاں الزامات و اعتراضات کی بہتات اس لئے بھی قابل فہم ہے کہ الزامات و اعتراضات قائم کر کے (خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرت رسولؐ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا مستشرقین کی حکمت عملی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے، کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ اور وہ افراد جن کا علم و مطالعہ راسخ نہیں، ان کے پروپیگنڈے سے بآسانی متاثر ہو سکتے ہیں، حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کے تمام اعتراضات والزامات کو مرتب کر کے اُن کا مفصل جواب دیا جائے، لیکن اس کی نہ فرصت ہے نہ موقع، تاہم ذیل میں ہم مختصراً سیرت رسولؐ

کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات والزامات بلکہ مفتریات کو نقل کر رہے ہیں تاکہ عام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ سیرت نبوی کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور کیسے کیسے الزامات واعتراضات عائد کئے ہیں، انہیں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے۔

نام، حسب نسب

(۱) یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلامؐ کا نام نامی اسم گرامی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں تھا بلکہ ماہومٹ (Mahomet) تھا، بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ "ماہونڈ" (Mahound) یعنی بقول ان کے "شہزادۂ تاریکی" کا نام تجویز کیا، اور بعض کے نزدیک بافومٹ (Baphomet) اور "بافسم" (Bafum) تھا؛ (۲) پیچ ذات (Low birth) تھے (العیاذ باللہ)۔ اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شد ومد کے ساتھ اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" مطبوعہ لندن (۱۹۰۵ء) میں پیش کیا۔ اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمد ایڈنبرا ۱۹۲۳ء ص ۷،xx۱۷،xx) ہی مسترد کر دیا بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپ کے جد امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری مملکت مکہ میں "افادہ" کی ذمہ داری تھی۔ اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے اُن سے معاہدہ کیا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: صدیقی مظہر الدین، ص ۱۴۳)

(۳) محمد دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardinal) تھے۔ خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب "اسلام" کو ایجاد کر لیا، اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا۔ (۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقے کے بانی تھے، (۵) مخالف مسیح (anti-christ) اور دشمن عیسائیت تھے، (۶) ترکوں کے پیغمبر تھے، (۷) بت پرست تھے (نعوذ باللہ) (۸) خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا؛ (۹) آپ بقول ایک مصنف معروب منافق وناپاک تھے۔ (۱۰) جینی برڈ (Genebrard) کے نزدیک

(خدانخواستہ) آپ حیوان (Beast) تھے، اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے تو ان کے حیوانی احوال کے لئے مناسب تھی (۱۱) آپ حاشا للہ، شہوت پرست Lascivious تھے، خود بھی ملوث تھے، اپنے پیروکاروں کو بھی ملوث کیا، (۱۲) دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے، (استغفر اللہ) (۱۳) وہ ایک ہنر مند، مکمل سیاست داں تھے۔

نبوت ورسالت

نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خود خیالی (auto Suggestion) کی یا خود القائی اور القائے نفس کا، (۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے۔ (۱۶) وہ بزعم خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بہر حال دوسروں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ ان پر وحی اترتی ہے، محمد نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھا رکھا تھا، جو اُن کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ ان کے کان میں سے دانے چگا کرتا تھا، اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتہ ربانی (جبرئیل) ان پر وحی نازل کر رہا ہے اور انہیں املا کرا رہا ہے۔ (۱۷) انہیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات، فریب حسی میں مبتلا تھے[1]۔ (۱۸) نزول وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا[2]۔ (۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے، کیونکہ وہ غیر متوازن اعصابی مزاج والے آدمی تھے[3]۔ (۲۰) اعصابی دورے پڑتے تھے، اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع الہام ہیں[4]۔ یہ نولدیکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے۔ (۲۱) اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے میں خود شکوک وتذبذب تھے۔ میور کے نزدیک ابتداءً انہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں، البتہ ایک طویل عرصہ تک شک وتذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے۔ (میور، لائف آف محمد، ۱۹۲۳ء۔ ص ۴۹، ۴۷) یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے، اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے۔ اگر ذرا بھی متذبذب ہوتا تو اپنی زوجہ محترمہ خدیجہؓ کو، اپنے بھائی علیؓ کو اپنے جگری دوست ابوبکرؓ کو کیونکر مطمئن کرتے۔ (۲۲) مذہبیت اور الہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا۔ (۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات

---

[1] حماد کے ص ۶۵، [2] ایضاً، عہد حاضر کا مستشرق، واٹ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد (بقیہ حاشیہ صفحہ پر)

کا علم تھا، (۲۴) نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا، یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی و رسول کی حیثیت سے تسلیم کریں (ملاحظہ ہو تفصیل جناب مظہر الدین صدیقی کا مضمون، اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد، جلد ۹ نمبر ۳ (۲۵) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے نعوذ خیال میں نبی کاذب تھے، (۲۶) وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب تھے، (۲۷) شیطان کے آلۂ کار، اور اس کے توہین آمیز جاسوس تھے، (۲۸) ترویج و اشاعت مذہب کے لئے تشدد کا سہارا لیا، (۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا، (۳۰) حتّی Hitti کے خیال میں حضورؐ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور لامنس کے نزدیک ان کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ (fiction) ہیں، (۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرہ سے خاص ملاقات رہی، (۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام وزنی الزام یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی، لیکن مدینہ جاکر بادشاہی میں بدل گئی، اور وہاں لشکر کشی انتقام خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔

کارہائے نبوت و رسالت، واقعات سیرت

(۳۳) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی، (۳۴) میور لکھتا ہے "کار نبوت کی ابتدا میں تو ایمانداری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انھیں بنیاد بنایا گیا، لیکن جب مطلب حاصل ہوگیا اور اقتدار حاصل ہوگیا، تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انھیں بالکل مردود قرار دے دیا" (۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی، واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جاکر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم "یہودیت" سے بدل دیا جائے۔ (۳۶) تحویل قبلہ، (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت و عیسائیت سے بیزاری کی کوشش ہے)

(حاشیہ ص ۸۸) ہے۔ (محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء ص ۱۹)۔ تفصیل کیلئے دیکھئے (صدیقی مظہر الدین ص ۱۴۴)۔ [۳] حاشیہ ص ۳۷۔

(۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے، (۳۸) محمدؐ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی، (۳۹) منشور مدینہ (Chorter of Madinah) میں حضور کا مقام و مرتبہ غیر متعین تھا، (۴۰) حضورؐ کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے، مارگولیتھ لکھتا ہے کہ "یہ بین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمدؐ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہوں کہ وہ اپنے ایک تکلیف دہ ہم وطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پاگئے" (صدیقی مظہر الدین۔ ص ۱۴۴) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے، (۴۱) محمدؐ نے قریش مکہ کو (بلاوجہ) اپنے خلاف بھڑکایا،[۱] (۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں تھیں[۲]، اور عربوں کی غربت و تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ، (۴۳) بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب تھا، اور اہل عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے۔[۳] (۴۴) جنگ موتہ اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔

متفرقات

(۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرتؐ محض قیصر عرب تھے، ایک سیاسی لیڈر تھے، (۴۶) جے سی آرچر کے نزدیک محمدؐ محض ایک صوفی اور مجذوب تھے، (۴۷) آپؐ (نعوذ باللہ) رہزنوں، قزاقوں

---

[۱] یہ مستشرقین کا عام الزام ہے، اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ غزوات پاکیزہ جذبات اعلیٰ وارفع مقاصد، اور شوق شہادت کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب و مفلوک الحال عربوں کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال و دولت کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو (قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر، ج ۱۷ × شمارہ ۵ مئی ۱۹۶۸ء ص ۷۷، ۸۰، نیز شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ۸۰،

[۲] دیکھئے صدیقی مظہر الدین، ص ۱۶۳، ۱۶۲

کے سردار Robber chief تھے، (۴۸) اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور محمدؐ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا، (۴۹) اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا اور محمدؐ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر، (۵۰) وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے، (۵۱) کثرت ازدواج اور میل الی النساء[1]۔ عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے[2]

(۵۲) آنحضرتؐ اور قرآن، تہذیب و تمدن، حریت و آزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی و سرکش دشمن تھے، کہ ان جیسا دشمن صفحۂ ہستی پر نمودار نہیں ہوا[3]، (۵۳) لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا[4]، (۵۴) داستانِ غرانیق، شیطانی آیات[5]، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے سورۂ نجم کی یہ آیت (۲۰) پڑھی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے:- تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ (یعنی یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر کے پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں (تفصیلات کے لئے دیکھئے سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۸-۳۲۷-۳۲۶)

(۵۵) واقعہ حضرت زیدؓ و زینبؓ، حضورؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ کا نکاح کر دیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی، آخر کار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دیدی، حضورؐ نے رسم جاہلیت مٹانے کے لئے اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لئے خود نکاح کر لیا، حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی، (۵۶) ان کا آہنی تابوت خانہ کعبہ

---

[1] سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۷۸۱، [2] صدیقی، مظہر الدین ص ۱۶۲ (حضورؐ کی شادیوں اور تعدد ازدواج کے بارے میں ذات رسالتؐ پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے جس کے ذریعہ وہ (نعوذ باللہ) آپ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان میں انھیں کوئی خیر، پاکیزگی، عفت اور حکمت نظر نہیں آتی)۔ [3] حماد سے (ص ۶۶) [4] شبلی، ج ۱ ص ۱۱۲۔

میں دو ستونوں کے درمیان معلق رہا۔ (۵۷) ابتدا میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لئے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا، لیکن جب قوت و اقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا، (۵۸) بانیٔ اسلام سے معجزات کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لئے قائم کی گئی، (۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا، حالانکہ یہ انکا خود ساختہ تھا۔

اعترافات اگرچہ گذشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور رسوایانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے تاہم یہ اُن کے مطالعۂ سیرت کا صرف ایک رُخ ہے جو اول تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے۔ ایک دوسرا رُخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تعظّم کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے منزہ ہر الزام سے مبرا، خلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرقع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور اُن کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر اُن کا کوئی مثیل نہیں ہے، اس موضوع پر اگرچہ دفتر کے دفتر نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں

۱- اثر انگیز شخصیت — "مسیحؑ کی وفات کے چار سال بعد ۵۷۰ء میں، مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا، جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا" (ڈریپر)[1]

۲- ناقابل فراموش — "اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج، ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے، تو کون ہے جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

اور ہارٹ کی کتاب:- (The 100 A Ranking of the most heflucut'al persons in History.) 1978 (P.33).

مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انھوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر دکھائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ انھوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے، جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کئے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیئے جو اُس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے، اور اس سے بھی آگے بڑھکر انھوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقائد و نظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا، پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود باطل سے نفرت" (لامارٹن (Histoire deca Turqui) ج ۲ ص ۷۷-۲۷۶ پیرس ۱۸۵۴ء)

۳- جامعیت کبریٰ "عالم الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانی مذہب) آئین و قانون ساز (شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی روحانی حکومت کے مؤسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو اُن سے زیادہ بڑا، اُن سے بڑھ کر عظیم ہو؟ (لامارٹن ایضاً)

۴- بے مثال کارنامہ کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ، اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراء تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں جس بڑے منصوبہ کو روبہ عمل لائے، اُس کی صورت گری بجز اُن کے کسی کی مرہونِ منت نہ تھی، اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا اُن کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا، اور آخر کار ایک اتنے بڑے مگر دیرپا انقلاب کو برپا کر دیا، جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی ڈو صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت و اسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے فارس، خراسان، ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقیہ کے تمام معلوم علاقوں پر، بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصہ پر بھی چھا گیا۔" (لامارٹن ایضاً)

۵- تاریخ کی پوری روشنی میں یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیح کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں، لیکن اُن تیس برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انھوں نے (نبوت سے پہلے) گذارے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آئندہ مزید انکشافات متوقع ہیں، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن! ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُن کی ماں کے بارے میں، اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اِس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسندِ نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پاکر یکدم خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر! البتہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے، یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے، ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس، تخمین و ظن، ماورائے فطرت روایات اور فسانہ و فسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے، حقائق سے آراستہ ہے، اور ہم یہاں حقیقی

معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل و فریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز دن کی روشنی میں جگمگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ اُنکی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں، اُن کی جوانی، ان کی اٹھان، اُن کے تعلقات ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحۂ ذہنی سفر اور ارتقاء وغیرہ، نیز انکی داخلی و باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتداء، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز و منفرد ہے، اور اب تک ایسی کوئی معقول و مستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔" (باسورتھ اسمتھ محمد اینڈ محمڈنزم، سندھ ساگر اکادمی لاہور ص ۱۲۔۱۱)

۶۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب | بہرحال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے، جن میں اگر ہمیں والٹیر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رُخ بدل گیا، انقلاب آگیا، انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب! (باسورتھ اسمتھ ایضاً ص ۷۲)

۷۔ منفرد مقام | ۔ تاریخ مذاہب و ادیان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی، اور اُن کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و ممیز کر سکے۔" (بوڈلے دی میسیج، ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۸)

۸۔ سب سے بڑا انسان | "دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم

پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی۔ لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جسکو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے۔" (مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء ج ۴ ص ۴۰۰) نیز بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داؤد مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

۹۔ عظیم و مخلص | عظیم۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے، انھوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا، اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی۔ بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لئے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے، ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔" (لیونارڈ اسلام ہر مورل اینڈ اسپریچوئل ویلو لندن ۱۹۲۷ء ص ۲۱، ۲۰)

۱۰۔ مقام و مرتبہ | ۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے۔ وہ لوگ جو اُن کے گرد جمع ہوئے اور جو ملت اسلامیہ کے اولین ارکان تھے۔ وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر راضی تھے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور اُن کے اُسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے، وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں، جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا۔" (گاڈفرے ڈی مومبائنز مسلم انسٹی ٹیوشن، لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۰)

۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے از خود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی

نازل ہوئی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟ پھر انھوں نے اُس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Imposter) تھے جیسا کہ معصوم مسیحی اُس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔" (لیتھر محمدؐ ازم، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۴)

۱۰۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم مشربوں کے فہم و ادراک کے مطابق تھا، اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم و رواج اور اُن کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات و نظریات سے بھی ایسی مناسبت و ہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی نے اسے قبول کیا، اور یہ سب کچھ پچاس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا۔ (کاونٹ ڈی بولین ویلیرز La Vie de Mohamet، ایمسٹرڈم ۱۷۳۱ء، ص ۴۳-۴۴)

۱۱۔ روشنی | "پس وہ روشنی آگئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لئے، ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی، چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ و جلال لئے ہوئے، اُس نے اُسے "وحی" کہا، اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل۔ اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے، ہمارے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش، دراصل ایک روحانی عمل ہے، جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے بقول نوالی، ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود کامل، جسم و روح، اسی حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا۔" (کارلائل دی ہیرو ایز اے پرافٹ)

۱۲۔ نور ہی نور | عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعہ پہلے پہل زندگی ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک گھومتے پھرتے

تھے کہ ایک "رہبر و پیغمبر" ان کی طرف بھیجا گیا، ایک پیغام کے ساتھ، جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے، اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لئے قابل ذکر بن گئے۔" (کارلائل)

۱۳۔ عظیم فاتح | "فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابل تعریف ٹھہریں گے، کہ اُس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انھیں جتنا بھی طیش آتا کم تھا، اور ان کے آتشِ انتقام کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا، مگر انھوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا، اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی و عبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجا لائے، صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے جنھیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا، اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا، لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال و حرکات کے مقابلہ میں، اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت و انسانیت سے تعبیر کیا جائے گا، (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ ۱۰۹۹ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انھوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذرِ آتش کر ڈالا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انھوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا اور کر و فر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا، اور جب قریش کے مغرور و متکبر سردار ان کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن سے پوچھا کہ "تمھیں مجھ سے کیا توقع ہے"؟ "رحم! اے سخی و فیاض برادر، رحم!" وہ بولے۔ "جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ انھوں نے فرمایا۔" (ارتھر گلمین دی سراسینز لندن ۱۸۸۷ء، ص ۱۸۴-۱۸۵)

۱۴۔ صاحب خلق عظیم | "اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے، اُن کا کھانا، پینا، اُن کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ ہی رہا جبکہ وہ اپنی طاقت و حکومت کی معراج تک پہنچے، انھیں تخیل و تصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں

ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات و احساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے، اُن کے خادم انس رضؓ کہتے ہیں کہ میں دس سال تک اُن کی خدمت میں رہا لیکن انھوں نے کبھی اُف تک نہ کہا، انھیں بچوں سے بہت محبت تھی، وہ انھیں راستے میں روک لیتے اور اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انھوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اُسے کیا ہو گیا ہے ؟ اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو، جب اُن سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے "میں بددعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"، وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے اور دوسروں کا مہمان نوازی کا انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش کی جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، اُن کے گھر کے باہر ایک چھپّر (صفّہ) تھا، جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے جن کی گزر بسر کا تمام تر انحصار اُنہی کی فیاضی پر منحصر تھا" (لین پول دی اسپیچز اینڈ ٹیبل ٹاک آف دی پرافٹ محمد، لندن ۱۸۸۲ء، ص ۲۹-۲۷)

۱۵۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کارلائل کے خطبات کے بعد سے مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان و عقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا، اُن پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق و کردار، اور اُن کی طرف امام و پیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں

یہ سب دلیل ہیں اُن کے اخلاصِ کامل کی، اس لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مدعی کاذب (Imposter) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں، مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اس لئے اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں، اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں اُن کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا، جب تک کہ کوئی الزام اُن کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے۔ (واٹ محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء، ص ۵۲)

●۔۔۔ "یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے کلیۃً خالی تھی، مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام و استحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اُس سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے اُن کے بود و باش سے نمایاں تھا۔" (ڈیون پورٹ اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن لندن، ۱۸۶۹ء جنز لاہور اڈیشن ص ۳۴-۱۳۳)

۱۶۔ مشن کی سچائی: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلاشک و شبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے ملک کی تعمیر و اصلاح کی ہے، ان کا اپنا مشن نہ تو بے بنیاد تھا، اور نہ فریب دہی، جھوٹ و افترا پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم و تبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رکاوٹیں بن سکیں، وہ سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔" (ڈیون پورٹ ایضاً)

۱۷۔ سچے رسول "جہالت! جس کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس وقت کی اقوام میں، ایک خدا پر یقین رکھتے تھے، اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انھوں نے بہ تاکید راست بازی اور دینداری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا، اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی حیّ و قیوم خدا کے لئے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت و احترام، اور سب کے ساتھ رحم و شفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل و توازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین اُن کے دین و مذہب کا حصّہ تھی، لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نفسِ روحانی کے مالک، اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔" (لنڈ سے مضمون، مطبوعہ ٹو ورلڈ، مانچسٹر، اگست ۱۹۴۲ء)

۱۸۔ امتحان سخت سے گذرے "ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گذرا تھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انھیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے، لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز و محترم ٹھہرے الّا یہ کہ جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔" (گبن زوال سلطنت روما ص ۱۰۸)

۱۹۔ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر "اسلام کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خواری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دختر کُشی کی رسوماتِ قبیحہ کا استیصال کیا، اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات و توہمات اور مادّیت و اشیا پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اُس بادشاہت کو انھوں نے عملاً اس زمین پر قائم کر دیا جس کی بشارت بڑے ذوق و شوق سے جناب مسیحؑ نے دی تھی۔" (گبن ایضاً ص ۶۹، ۷۰)

۲۰۔ ہمہ گیر اصلاح "ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی جس نے اتنی بہت سی اور تادیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع و اقسام کی بت پرستی کے بدلے جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا، جس نے دختر کُشی کی رسمِ قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھہرایا، جوئے کی ممانعت کی، نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدد ازواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اُس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انھوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی، پامردی و استقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اُس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کی۔ یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انھیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہؓ کی باہوں میں آخری سانس لینے تک۔" (ڈیون پورٹ)

۲۱۔ عظمتوں کے نشان "حالات، مواقع، اور وقت سب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیا، اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع و ترقی کی راہ ہموار کی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں صفات و کمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اُس کی تین جہتیں تھیں۔ ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست و نگرانی میں اُن کی بصیرت، اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت و حذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔ جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اُسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کارناموں پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ حالات نے انھیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذ و نادر حاصل ہوتے ہیں، بالکل وقت کی آواز بن کر، ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انھیں اگر حاصل نہ ہوتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انھیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا

اور اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا۔" (واٹ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین، آکسفورڈ پریس ۱۹۶۱ء، ص ۲۳۳-۳۶)

۲۲۔ صدق و صفا | "یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدق کی دلیلِ قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ اُن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ اُن کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے، اور اگر انھیں ان کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔" (ایچ، جی ویلز بحوالہ ذکریا ہاشم ذکریا، ص ۲۷۰)

۲۳۔ اتمام و اکمال | "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپؐ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپؐ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" (مارگولیتھ بحوالہ سیرۃ النبی جلد چہارم از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۹۹)

مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

از

جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، چیرمین اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ

مفتی عدالت اودھ مفتی محمد اصغر کے اکلوتے بیٹے، محمد یوسف کی پیدائش ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں ہوئی، درسیات کی تکمیل والد ماجد نیز مفتی محمد ظہور اللہ فرنگی محلی اور ماہر ریاضی و ہیئت مولانا محمد نور اللہ فرنگی محلی کے ایسے ممتاز اساتذہ خاندان سے کی۔ وسیع النظر فقیہ ممتاز ماہرِ معقولات، صاحبِ درس و تدریس اور صاحبِ تصانیف کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔

والد کی وفات (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) کے بعد مفتی محمد یوسف جب کہ ان کی عمر اکتیس ۳۱ برس کی تھی، اُن کی جگہ حکومت اودھ میں مفتی عدالت لکھنؤ ہوئے۔ یہ محمد علی شاہ (اودھ کے تیسرے بادشاہ) کا زمانہ تھا، انتزاع سلطنت اودھ (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) تک، پھر مزید ایک سال ۱۸۵۷ء تک (لکھنؤ میں انگریزی راج کے زمانے میں) بھی مفتی عدالت رہے۔ اس طرح اٹھائیس ۲۸ سال تک انھوں نے اودھ کی سرکاری خدمات انجام دیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اُن کا گھر بار لٹا، اس بربادی میں ان کا ذاتی کتب خانہ بھی شامل تھا، بے روزگاری اور تنگدستی کا دور اس کے بعد شروع ہوگیا، مگر انگریزی حکومت کی ملازمت کو قبول نہیں کیا، حالانکہ ۱۸۵۸ء کے بعد انگریزی حکومت استحکام کے ساتھ اودھ میں قائم ہوگئی تھی، انگریزی ملازمت سے انکار کا سبب کیا ہوا؟

انگریزی ملازمت سے انکار | لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں دوبارہ انگریزی راج قائم ہو جانے کے بعد انگریزی سرکار کو جو نوابی دور کے شرعی نظام عدالت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی، تجربہ کار ملازمین عدالت درکار تھے

اور مفتی صاحب کی شخصیت اس پہلو سے متعارف اور ممتاز تھی۔ ان پر سرکار کی نظریں پڑیں مگر جو ہوا وہ ایک واقعہ کے نتیجے میں برعکس ہوا، واقعہ کے راوی کا چشم دید بیان حسب ذیل ہے :-

"ایک انگریز فرنگی محل میں مفتی محمد یوسف کو پوچھتا ہوا آیا، میں اُن کے دروازے تک اُسے لے کر گیا اور مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا "ایک انگریز ملنے آیا ہے" وہ بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے کچھ تحریر کر رہے تھے، اُسے اندر بلالیا، ایک شکستہ مونڈھے پر بٹھایا، اُس نے نکاح طلاق سے متعلق بعض مسائل دریافت کرنے کے بعد مفتی صاحب سے استفسار کیا کہ "جناب کی بسر اوقات کی کیا صورت ہے؟" فرمایا "بظاہر اسباب کچھ باقی نہیں رہا ہے" اُس نے سرکاری ملازمت کی پیش کش کی تو فرمایا "مدتوں شرع کے احکام جاری کر چکا ہوں، خدا سے شرم آتی ہے کہ اس عمر میں خلافِ شرع احکام دوں، اور انگریزی حکومت میں یہ ضروری ہوگا" انگریز نے جو اودھ کا فنانشل جوڈیشل کمشنر تھا قول دیا کہ ایسی ملازمت نہ ہوگی جس میں خلاف شرع حکم دینا پڑے، اور کہا کہ "آپ کے لئے رجسٹراری کا عہدہ تجویز کرتا ہوں، بس ایک کمرہ دیدیجئے، ایک منشی اس میں بیٹھ کر سب کام انجام دے لے گا۔ سہ پہر کو آپ صرف رجسٹر پر اور دستاویزوں پر دستخط کر دیا کریں گے، رجسٹری کا دفتر آپ ہی کے یہاں رہے گا"

مسلمان منشی نے جسے فنانشل اور جوڈیشل کمشنر دوسرے دن خود پہنچانے آیا تھا، دن بھر کام کرنے کے بعد سہ پہر کو رجسٹر مع دستاویزات بغرض دستخط پیش کیا، مفتی صاحب نے پہلی دستاویز کو پڑھنا چاہا، منشی نے کہا "اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے میں نے جانچ لیا ہے سب صحیح و مکمل ہے"، مفتی صاحب نے فرمایا "بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر پڑھے دستخط کر دوں دستخط تو بمنزلہ شہادت (گواہی) ہوتے ہیں"۔ رجسٹر کھولا، پہلی ہی دستاویز سودی قرضے کی نکلی، چہرہ سُرخ ہو گیا، رجسٹر اٹھا کر پھینک دیا۔ منشی سے کہا "ابھی یہاں سے نکل جاؤ"۔

منشی نے کمشنر صاحب سے جا کر صورتِ حال بیان کی، وہ اس خیال سے دوسرے دن منشی کو لیکر پھر فرنگی محل آیا کہ منشی کی کسی نالائقی پر مفتی صاحب برہم ہوگئے ہوں گے۔ جیسے ہی انگریز سامنے آیا، اُس پر برس پڑے، اور کہا "بے دین سے اس کے سوا توقع ہی کیا ہو سکتی تھی، میری ہی غلطی تھی کہ ایسے کے کہنے میں آ گیا" اور زار و قطار رونا شروع کیا وہ چُپ بیٹھا رہا، کچھ وقفے کے بعد اس نے استدعا کی کہ "آخر ارشاد ہو منشی نے کیا غلطی کی، فرمایا "سودی قرضے کی دستاویز پر میرے دستخط لینا چاہتا تھا جب کہ حدیث شریف میں سودی قرضے کی دستاویز لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے سب پر لعنت آئی ہے"۔

کمشنر نے بہت معافی چاہی اور کہا "اب ایسی صورت تجویز کروں گا کہ یہ زحمت بھی نہ ہو"، مفتی صاحب نے بالکل نامنظور فرما دیا۔ اس کے بعد بھی یہ کمشنر کبھی کبھی مسائل دریافت کرنے آیا کرتا تھا۔

چشم دید راوی مصنفِ تذکرہ علمائے فرنگی محل کے والد تھے، واقعہ کے زمانے میں چشم دید راوی کی عمر ۱۳ سال کی تھی (۲)

مدرسہ حنفیہ جونپور میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد، تقریباً پانچ برس، اسی عُسرت اور خانہ نشینی میں گذارے یہاں تک کہ مفتی صاحب کے عزیز اور شاگرد رشید مولانا محمد عبدالحلیم فرنگی محلی (حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے والد ماجد) نواب سالار جنگ کی طلبی پر جب حیدرآباد دکن ۱۲۷۹ھ م ۱۸۶۲ء میں جانے لگے تو انھوں نے حاجی امام بخش رئیس جونپور (مدرسہ امامیہ حنفیہ جونپور کے بانی) سے اپنی جگہ اپنے اُستاد کو مامور کرا دیا۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی تقریباً نو برس اس مدرسے کے صدر مدرس رہے تھے، مگر مفتی صاحب کے درس کا فیض جونپور میں اس قدر عام ہوا کہ تمام مشرقی اضلاع میں ان ہی کا سکہ چلنے لگا۔ یہاں ان کے حلقۂ درس سے ایسے ایسے فضلائے روزگار نکلے جو خود نوادر العصر ثابت ہوئے۔

مفتی صاحب کے تلامذہ کسی کو بھی اپنے استاد کا مثیل ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے، اُن کے ایک مشہور تلمیذ مولانا محمد فاروق[۱] مرحوم چریاکوٹی نے، جنھوں نے مدرسہ امامیہ حنفیہ جونپور ہی میں مفتی صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا، اپنے استاد کی شان میں، جو فارسی مثنوی لکھی تھی، وہ مبالغے اور غلو کی تمام مشرقی روایات کے باوجود اس گہرے تأثر کو بہرحال ظاہر کر رہی ہے جو مولانا چریاکوٹی کے ایسے فاضل پر اپنے استاد کا تھا، چند اشعار مثنوی کے یہ ہیں

چو بر اوجِ کمالِ خود رسیدم   ز سنگِ آستانے بوسہ چیدم
چہ سنگے؟ سنگِ ایوانِ شہِ دیں   کہ دارد از شریعت ملک و آئیں

---

[۱] مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اپنے بڑے بھائی (سرسید کے علمی رفیق) مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (م ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۳ء) سے حاصل کی، ہیئت کا فن مولانا محمد رحمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء) بانی مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے، اور حاشیہ زاہدیہ بر ملا جلال مولوی ابوالحسن منطقی سے اور بعض علوم ملا محمد نعمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) سے پڑھے، علوم معقول و منقول و ریاضی و ادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی انھیں دست رس حاصل تھی، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے تو چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ میں آئے، کانپور کے کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اُس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم (سنہ ۱۳۲۳ھ میں) دارالعلوم کے معتمد مقرر ہوئے تو مولانا چریاکوٹی ترک ملازمت کرکے بلیا میں وکالت کرنے لگے اور بعض انگریز حکام کو عربی پڑھانے لگے، آخر میں ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں مولانا شبلی مرحوم نے پھر ان کو دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلا لیا، چند روز کے بعد غازی پور گئے تھے کہ اسباب سامان یہاں سے آئیں کر دیں، ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی (۳)

لطیفہ: ضلع بستی میں ایک انگریز کلکٹر آر. بی. ڈیوہرسٹ تھا جو مولانا فاروق چریاکوٹی کا شاگرد تھا، وہ فارسی و عربی کا بڑا عالم ہو گیا تھا، وہ بعد میں "الہلال" کا ترجمہ انگریزی میں کرکے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجتا تھا، کسی وکیل کو انگریزی میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، اردو میں بحث کرنے پر اصرار کرتا تھا، ایک صاحب سے اُن کا نام پوچھا، انھوں نے کہا "نُصرت علی" اس نے فوراً اصلاح کی "نَصرت علی" انھوں نے کہا غلطی ہوئی، پھر اس نے کہا: غلطی ہوئی (۴)

جنابِ اوستادِ کعبۂ جاہ   دلیلِ راہِ مردانِ حق آگاہ
سحابٌ ساکبٌ جود النوال   ہمامٌ صائدٌ طود الکمال
کمیٌّ فی الوغا لیثُ الاعادی   کریمٌ فی الندیٰ غیثُ الایادی
کریمے یوسفِ مصرِ معانی   غزالے مرتعِ فضلش غزالی
چہ یوسف؟ مصرِ معنی را عزیزے   نیرزد ملکِ جم پیشش بہ چیزے
بہ صورت شمعِ بزمِ یوسف آمد   بمعنی غیرتِ بو یوسف آمد
بہ گیتی در کمالے ہم سرش نیست   بہ جیبے خالی از خاکِ درش نیست
بشوقِ مکتبِ درسش فلاطوں   دلے دارد چو جامِ بادہ پُرخوں
ادب گیرد بہ دبستانش ارسطو   بہ پیشش بوعلی تہ کرد زانو (۵)

مولانا فاروق چریاکوٹی کے شاگرد رشید علامہ شبلی نعمانی بھی (جنھوں نے مفتی صاحب کا زمانہ پایا مگر ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا) اپنے استاد محترم ہی کے زیر اثر مفتی صاحب کی جلالت علمی سے اس درجہ متاثر تھے کہ مفتی صاحب کی وفات کے دس بارہ سال بعد جب مدرسہ امامیہ حنفیہ جون پور میں مفتی صاحب کی مسند درس پر ایک اور فاضل درس و تدریس کے لئے بیٹھے تو علامہ شبلی نے اپنے ایک شاگرد سے جو اسی مدرسہ میں تکمیل درسیات کے لئے داخل تھا، اس صورت حال اور اس قحط الرجال پر اپنے صدمے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:-

آہ! از دستِ فلک کہ بہ جائے افادات مفتی محمد یوسف صاحب اکنوں ایں شعر بزبانِ حال دارد ؎

از ہجوم چند در ویرانۂ ما جا نماند   آں قدر آباد شد آخر کہ ما برخاستیم (۶)

بعض تلامذہ | مفتی صاحب کے مدرسہ امامیہ حنفیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے مامور ہوتے ہی بقول مصنفِ

"حیات شبلی" — خود مدرس کی دھوم دھام دور دور پہنچی، اور لائق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہو گیا"۔ لیکن مفتی صاحب کی شمع تدریس کے گرد علم کے پروانے بہت شروع ہی سے جمع ہونے لگے تھے۔ افتاء سرکاری کا عہدہ ۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء میں سنبھالنے سے پہلے ہی مفتی صاحب نے تدریس شروع کر دی تھی، اور اکتیس[۳۱] برس کی عمر میں جب حکومت اودھ میں عہدہ سنبھالا تب بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شغل برقرار رکھا۔ ان کے ۱۸۵۷ء ۱۲۷۴ھ سے پہلے کے تلامذہ میں وہ حضرات ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں اُن سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، اُن میں اُن کے خاندان کے افراد بھی شامل ہیں، جن میں مولانا عبدالحلیم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن کے نامور اور مشہور عالم فرزند مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے شروع سے آخر تک اپنے والد ماجد ہی سے پڑھا تھا، اور مولانا عبدالحئی کے وسیع ترین حلقۂ درس نے جو کمال حاصل کیا اس کے پیش نظر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ مفتی صاحب سے تلمذ کا سلسلہ (بیک واسطہ) اطراف ہند و بیرون ہند کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا، جس طرح مولانا فاروق چریاکوٹی کے واسطے سے نہ صرف اولین فضلائے ندوہ بلکہ مغربی اہل علم بھی اس سلسلۂ تلمذ سے منسلک ہوئے۔

دوسرے قابل ذکر فرنگی محلی تلمیذ، مولانا محمد عبدالرزاق (مشہور مرشد، عالم اور قومی و ملی رہنما مولانا محمد قیام الدین عبدالباری کے جد امجد) تھے، جنھوں نے فرائض، معقولات اور ہدایہ مفتی صاحب سے تحصیل کیے اور فاتحۃ الفراغ بھی ان ہی سے پڑھا (۷) اگرچہ وہ شیخ طریقت کی حیثیت سے معروف ہیں، لیکن ان کی زندگی کا آغاز صاحب درس، مفتی اور مصنف کی حیثیت سے ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے تلامذہ کی نام بنام فہرست تیار کرنا ممکن نہیں، تاہم ایک قلمی بیاض میں اُن کے بعض اُن بیرونی شاگردوں کے نام بھی نظر آئے جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل اُن سے درسیات کی تکمیل کی تھی، ان میں قابل ذکر منشی امیر احمد مینائی امیر، ان کے بڑے بھائی منشی طالب حسین مینائی اور مولوی بندہ حسن لکھنوی ہیں۔[۸] امیر مینائی کے سوانح نگار ممتاز علی آہ نے بھی لکھا ہے :-

"اٹھارہویں، انیسویں برس مفتی (محمد) یوسف اور مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی سے فقہ اور

اصول پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے اور فضیلت کی پگڑی باندھی گئی"۔[۹]

الٰہ آباد کے دائرہ شاہ رفیع الزماں کے سجادہ نشین، فاضل شیخ، ممتاز مدرس اور ماہر طبیب حکیم مولانا سید شاہ فخر الدین احمد عرف حکیم بادشاہ مرحوم کو بھی بعض تذکروں میں مفتی صاحب کا شاگرد دکھا دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔[۱۰] دیگر حوالوں کی کتابوں سے مفتی محمد یوسف کے چند نامور طلبہ کے نام ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

(۱) شیخ محمود بن مولانا کرامت علی جون پوری (۲) مولانا سعادت حسین بہاری (۳) مولانا سلامت اللہ جیراج پوری (۴) مولانا شبلی بن سخاوت علی جون پوری (۵) مولانا شکر اللہ صبر جدی (۶) مولانا عبداللہ غازی پوری (۷) مولانا عبداللہ جیراج پوری (۸) مولانا وکیل احمد سکندر پوری (۹) مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری۔

یہ تمام وہ حضرات ہیں جنھوں نے جون پور میں مفتی صاحب کے قیام کے زمانے میں ان سے پڑھا تھا۔ بعض تلامذہ کے تحت سطور بالا میں جو نام درج ہوئے تھے وہ (۱) مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی (۲) مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی (۳) امیر مینائی (۴) طالب حسین مینائی (۵) مولانا بندہ حسن لکھنوی۔ (۶) علامہ فاروق چریاکوٹی،

علمی، ادبی اور تدریسی حیثیتوں سے یہ سب تلامذہ بجائے خود تاریخ کے مالک ہیں۔

مفتی صاحب کے بارے میں مولانا محمد عبدالباقی (فرنگی محلی مہاجر مدنی) نے لکھا ہے :-

وکانت له فی الفقه واصوله	مفتی صاحب کو فقہ اور اصول فقہ
الید الطولی ..... وکان	میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی تصنیف
تقریره افضل من تحریره[۱۱]	سے زیادہ بہتر ان کی تدریس تھی۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے جو بیک واسطہ مفتی صاحب کے شاگرد تھے اور معاصر بھی لکھا ہے:-

(۱) تذکرۂ علمائے ہند (مصنفہ رحمان علی) میں مولانا شاہ فخر الدین احمد الٰہ آبادی کے ذکر میں لکھا ہے:-

(بقیہ حاشیہ پر)

کان یوسف عصرہ فی الجمال	شکل و صورت اور فضل و کمال میں
والکمال جامعاً للفروع والاصول	اپنے عہد کے یوسف تھے، علوم میں فروع
حاویاً للمعقول والمنقول ذا	اور اصول کے جامع، معقول اور منقول
مجاھدۃ وریاضۃ وعبادۃ و	کے ماہر، عبادت، ریاضت، کشف و
مکاشفۃ متہجداً متعبداً [۱۱۳]	عرفان سے متصف، تہجد گزار، عبادت شب زندہ دار،

شب و روز کے معمولات | مفتی صاحب کے روز و شب کے احوال اُن کے ایک جون پوری مرید کی روایت کے مطابق اس طرح تھے۔

"مفتی صاحب کا معمول تھا کہ نصف شب کے بعد بیدار ہوتے۔ عبادت اور ذکر بالجہر فرماتے، نماز فجر کے بعد تلاوت، اس کے بعد ورزش اس کے بعد غذا نوش فرماتے اور شب و روز میں صرف اسی وقت غذا نوش فرماتے، اس کے بعد درس شروع ہوتا جو ۱۱ بجے دن تک

(بقیہ حاشیہ صـ ۱۱۳) "بہ شہر لکھنؤ در خدمت علمائے عصر یعنی مفتی محمد یوسف و مولوی نعمت اللہ و مفتی محمد اصغر و مولوی حسین احمد لکھنوی فرنگی محلی و آخون شیر محمد ولایتی تحصیل علوم متعارفہ و متداولہ نمودہ [۱۱۲]"

شاہ صاحب کی خود نوشت سوانح عمری جو ابتک قلمی تھی اور فرنگی محل کے ذخیرہ کتب میں راقم الحروف کو دستیاب ہوئی تھی، شاہ صاحب کے خانوادے کے سید مظفر حسن (سابق وزیر نقل و حمل اتر پردیش) نے مع اُردو ترجمے کے شائع کر دی ہے، اس میں شاہ صاحب نے فرنگی محل میں اپنے اساتذہ کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ کس سے کون کتابیں پڑھیں۔ ان میں مفتی محمد یوسف کا نام نہیں ہے، ان کے اساتذہ میں مولانا محمد برہان الحق فرنگی محلی مولانا محمد معین فرنگی محلی مفتی محمد اصغر فرنگی محلی مولوی محمد ولی اللہ فرنگی محلی، مولانا محمد نعمت اللہ فرنگی محلی، آخون شیر محمد ولایتی (شاگرد مفتی محمد ظہور اللہ فرنگی محلی) اور مولوی محمد اسمٰعیل لندنی (شاگرد علمائے فرنگی محل) ہیں [۱۱۵] شاہ صاحب کے ایک استاذ مولانا حسین احمد لکھنوی فرنگی محلی کے نام سے تذکرہ علمائے ہند میں مذکور ہیں، یہ علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے، ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے حدیث کا درس دیتے تھے اس لئے "محدث" نام کا جزو ہو گیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تھی اور بعض علمائے فرنگی محل نے ان سے حدیث پڑھی۔

ہوتا، اس کے بعد کچھ دیر تالیف و تصنیف فرما کر آرام فرماتے، پھر نماز ظہر پڑھتے، اس کے بعد پھر تدریس فرماتے، مغرب کے بعد پھر تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے، بعد عشا آرام فرماتے" [۱۱۶]

طریقہ درس سے متعلق واقعہ | مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی نے مفتی صاحب کے "درس" کے سلسلہ میں ایک بار اس جماعت کو پڑھاتے ہوئے جس میں راقم بھی شامل تھا ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا (مولانا عنایت اللہ ۱۵-۱۹۱۴ء / ۳۴-۱۳۳۳ھ میں ایک سال کے لئے مدرسہ امیہ حنفیہ (جون پور) میں صدر مدرس رہے تھے، اس زمانہ تک مفتی صاحب کے دیکھنے والے نیز مرید اور بعض بلا واسطہ شاگرد، جونپور اور اطراف میں موجود تھے)

"ایک طالب علم نے جو مفتی صاحب کے درس کی شہرت سنکر اپنی درسگاہ کی تعلیم ترک کر کے جونپور آیا تھا، کچھ دونوں درس میں شریک رہ کر محسوس کیا کہ اس درس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی جو باعث ترجیح ہو، اتفاقیہ اُس نے ہم درس طلبہ سے بیان بھی کر دیا، مفتی صاحب تک بھی یہ خبر پہنچی۔ اسے بلا کر فرمایا کہ "کل سویرے ہی سبق پڑھنے آجانا، سویرے جن طلبہ کا درس مقرر تھا ان کی آمد پر ان سے کہدیا کہ آج ان طالب علم کا سبق ہوگا، اور صبح اس کا درس شروع کر دیا۔ زیر درس عبارت کی تشریح میں عبارت اور فن کے رموز و نکات بیان کرنا شروع کر دیئے، یہاں تک کہ ۱۱ بج گئے، بعد ظہر بھی پھر بعد عصر بھی یہی سلسلہ جاری رہا، دوسرے اسباق اُس دن موقوف رہے، مغرب کے قریب طالب علم فوراً استاد کے قدموں میں سر رکھ کر گستاخی کی معافی چاہی، مفتی صاحب نے درگذر کرتے ہوئے فرمایا "اگر اسی طرح پڑھانے سے اطمینان ہوتا ہے تو دوسرے تمام اسباق کے لئے وقت کہاں بچ سکے گا؟"

شاگردوں کی تربیت | مفتی صاحب زیر درس طلبہ کی تربیت پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے، درس کے مقررہ وقت سے تاخیر پر، خواہ تاخیر کا سبب معقول ہی کیوں نہ ہو سخت سرزنش کرتے، اسی طرح لباس کا اہتمام

کرنے والے طلبہ سے بھی برہمی ظاہر فرماتے، اس سلسلے میں مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کے دو واقعے ان کے تذکرے میں درج ہیں، اول یہ کہ مولانا کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی، مفتی صاحب سے درسیات کی آخری کتابیں پڑھ رہے تھے (اُس زمانہ میں مفتی صاحب اپنے پردادا کے نانہالی مکان میں رہتے تھے جو فرنگی محل سے میل بھر کے فاصلہ پر سوت پٹی[1] میں تھا) فرنگی محل سے "سوت پٹی" جانے میں ایک نالہ پڑتا تھا، جہاں اکثر دن میں بھی بھیڑیا آجایا کرتا تھا، مولانا گھر سے جارہے تھے کہ نالے کے قریب معلوم ہوا کہ بھیڑیا آگیا ہے اور ایک شخص کو زخمی کرچکا ہے، لوگ بھاگ رہے تھے، مولانا بھی بھاگے اور گر پڑے، اس سے قدرے تاخیر ہوگئی، مفتی صاحب نے تاخیر پر بہت غصہ کیا اور سبق پڑھانا شروع کردیا، سبق کے بعد فرمایا "اٹھو خون دھوؤ" اور کپڑے منگا کر پہنوائے اور خود گھر پہنچا گئے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے مشروع کا پائجامہ اور ٹبک کا کرتا بنوایا اور اس کو پہن کر مفتی صاحب کے مکان پر پڑھنے گئے، مفتی صاحب نے ملاحظہ فرماتے ہی کتاب بند کردی اور فرمایا "جب اس قدر جوڑے کا خیال ہے تو بس تحصیل علم ہوچکی" (مفتی صاحب مولانا کے حقیقی بڑے پھوپھی زاد بھائی تھے) مولانا نے

---

① سوت پٹی، آج کل وہ سڑک جسے جگت نرائن روڈ کہتے ہیں جو میڈیکل کالج سے شروع ہوکر رفاہ عام اور کرسچین کالج ہوتی ہوئی گولہ گنج سے آگے چلی جاتی ہے اس میں وہ بڑا علاقہ جہاں سٹی اسٹیشن رفاہِ عام اور چھوٹی ریلوے لائن کے گزرنے کے لئے چھتے بنے ہوئے ہیں، یہ پورا علاقہ ریزیڈنسی تک "سوت پٹی" کہلاتا تھا جہاں بڑے بڑے بازار اور محلات تھے، عام قبرستان بھی تھا (اس قبرستان میں مشہور اردو شاعر میر تقی میر کی بھی قبر ہے) ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں یہ بستی تہس نہس ہوگئی، بہت کچھ سڑکیں نکالنے میں کام آگئی، اور جگہ جگہ نئی تعمیریں ہوگئی ہیں، یہاں مفتی محمد مراد لکھنوی کا جو شہر کے ایک رئیس تھے، مکان تھا، مفتی مراد، مفتی محمد یوسف کے پردادا کے حقیقی نانا تھے، مفتی مراد کی ایک ہی بیٹی تھیں، اس حساب سے ان کی املاک ان کی بیٹی کی اولاد کے حصے میں آئی۔

کسی طرح سے گاڑھا مہیا کیا اور اس کا کرتا پائجامہ بنوایا، ٹبک کا کرتا گاڑھے کے پائجامہ کے ساتھ اور گاڑھے کا کرتا مشروع کے پائجامے کے ساتھ پہن کر جب کئی بار مفتی صاحب کے یہاں گئے اور انھوں نے دیکھ لیا تب سبق پڑھنے کی اجازت دی۔

بیعت | مفتی محمد یوسف نے چودہ برس کی عمر میں مولانا شاہ احمد انوار الحق فرنگی محلی (م ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) سے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں بیعت کی تھی، ایک ہی سال کے اندر مرشد کا وصال ہوگیا، مرشد کے خلیفہ (اپنے والد ماجد کے حقیقی چچیرے بھائی) مولانا محمد عبدالوالی (م ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء) سے اوراد و اذکار حاصل کئے . . . . اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے، مفتی صاحب سے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ کی اشاعت بھی ہوئی، ان کے مریدین میں ایک صاحب حافظ قدرت اللہ جون پوری بھی تھے جنھوں نے مفتی صاحب کے معمولات روز و شب کی روایت مصنف تذکرہ علمائے فرنگی محل سے کی ہے۔

مسئلۂ جہاد پر فتویٰ | مفتی صاحب کی سرکاری ملازمت کے آخری سال میں اودھ میں ایک سانحہ پیش آیا، وہ یہ کہ اجودھیا (فیض آباد) میں واقع ہنومان گڑھی[1] میں مغل دور کی ایک چھوٹی مسجد تھی جسے اودھ کی حکومت کے ضعف کے زمانے میں شہید کردیا گیا تھا، ایک صاحب شاہ غلام حسین نامی ایک جمعیت کے ساتھ مسجد کی واگذاری کی کوشش میں اجودھیا پہونچ گئے اور بابری مسجد میں قیام کرکے اپنے مقصد کے حصول کی سعی میں مصروف ہوگئے کہ اچانک ایک مسلح بڑی جمعیت نے بابری مسجد پر حملہ کرکے مسجد میں مقیم تمام لوگوں کو قتل کردیا، قرآن شریف کی بھی بے حرمتی کی، اس سانحے کے مشہور ہوتے ہی راجدھانی لکھنؤ میں ہل چل مچ گئی۔ اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کا دور تھا، اور وزیر اعظم نواب علی نقی خاں تھے، جنھیں

---

[1] کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی نے لنکا کی فتح کے بعد اجودھیا کے اس ٹیلے پر ہنومان کو بٹھایا تھا اس بنا پر وہ "ہنومان بیٹھک" کہلانے لگا تھا، مغلیہ دور میں اس بلند جگہ ایک چھوٹی سی مسجد بھی بن گئی تھی، شجاع الدولہ (نواب وزیر اودھ) کے زمانے میں جب وہ بکسر کی مہم میں مصروف تھے، ایک اتیت نے وہاں چھپر ڈال کر ہنومان کی مورتی نصب کردی، مسجد میں رہنے والے مؤذن نے اس موقع پر کوئی مزاحمت نہیں کی۔

بادشاہ سے زیادہ انگریزوں کا وفادار تاریخ میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مسلم رعایا نے نواب علی نقی خاں سے دادرسی چاہی، انھوں نے ہنومان گڑھی میں مسجد ہونے کا ثبوت مل جانے پر مسجد بنوا دینے اور مجرموں کو سزا دینے کا یقین دلایا، پہلی جانچ رپورٹ ثبوتِ مسجد کی آئی جسے دربار کی بیرونی اور اندرونی ریشہ دوانیوں نے مسترد کرا دیا، دوسرا جانچ کمیشن مقرر ہوا جس نے مختلف رپورٹ دی، اسی دوران میں مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی کی قیادت میں ایک نجی لشکر تیار ہو گیا جس نے سرکاری وعدوں میں لیت ولعل کا اندازہ کر کے خود اجودھیا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اس پیش قدمی کو روکنے کی سرکاری تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی گئی کہ علمائے فریقین سے استفتاء کیا گیا کہ نجی لشکر کی پیش قدمی زمرۂ جہاد میں داخل ہے یا نہیں؟ مفتی محمد یوسف سے بھی استفتا کیا گیا، انھوں نے جو جواب دیا اسے سرکار کی حمایت سے تعبیر کیا گیا اور مفتی صاحب سرکاری ملازم تھے بھی، اس صورت حال نے مفتی صاحب کو اچھا خاصا مطعونِ خلائق بنا دیا، فرنگی محل کے بیشتر علماء مولانا امیٹھوی کی علاً بھی تائید کر رہے تھے، اور غیر سرکاری استفتاء جو تیار کیا گیا تھا اس کے جواب میں بعض علمائے فرنگی محل نے فرضیتِ جہاد کا حکم بھی دیا تھا، جن میں خود مفتی صاحب کے شاگرد مولانا شاہ محمد عبد الرزاق فرنگی محلی بھی شامل تھے، نیتوں کو زیر بحث اگر نہ لایا جائے تو "نوازل وحوادث" میں فقہاء اور صاحبانِ افتاء کا اختلاف بہت عام بات ہے، زیر بحث معاملہ محض فقہی ہوتا تو اس اختلاف کی سنگینی اس قدر محسوس نہ کی جاتی، مگر اس معاملہ کا غالب پہلو جذباتی تھا۔[۵۱]

بہر حال مفتی صاحب کو اس دور میں اچھی خاصی رسوائی کا سامنا رہا، عبارت استفتاء مختصراً اور اس پر مفتی صاحب کا مکمل جواب ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

عبارتِ استفتاء | مولوی امیر الدین علی بانتقام بے ادبی کلام مجید و انہدام مسجد و کشتہ شدن شہیدان اودھ کمر ہمت برائے جہاد بستہ راہی ہنومان گڑھی می شوند، در مقام دریاباد افواج شاہی سدِ راہ شدہ ممانعت کوچ می سازند، مولوی صاحب فسخ عزیمت نمی سازند، بادشاہ

باعثِ فسادہ کم بالادست مجبور شدہ بمصلحت چند ایام منعِ روانگی می فرمایند، دریں حال اگر . . . مجادلہ ومقاتلہ از مجاہدان وافواج سلطانِ اسلام بوقوع آید پس مرگ مسلمانان طرفین چگونہ خواہد بود؟

(مولوی امیر الدین علی کمربستۂ جہاد ہیں، شاہی فوج کے روکنے سے رک نہیں رہے ہیں، بادشاہ، بالادست حکام (مراد انگریز) کی ناراضگی کے اندیشے سے مجبور ہو کر مولوی صاحب کو مصلحتاً چند یوم کے لئے روانہ ہونے سے روک رہے ہیں، اس صورت حال میں اگر مجاہدین اور شاہی فوج میں تصادم ہو جاتا ہے اور اس میں لوگ کام آتے ہیں تو دونوں طرف کے مارے جانے والے مسلمانوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں علمائے دین؟)

مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی نے تفصیلی جواب لکھا (وہ بھی عدالت اودھ میں مفتی تھے) اور فتوی صادر کیا کہ مجاہدین کو آگے جانے کے بجائے واپس آجانا چاہئے یہ جہاد نہیں ہے۔

مفتی سعد اللہ کی تصویب کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف نے یہ جواب دیا :-

جواب | فی الواقع فسخ عزیمت می باید و در شہادت دغدغہ است، واللہ اعلم کتبہ محمد یوسف۔

(واقعی آگے کا قصد ترک کر دینا چاہئے، شہادت کا مرتبہ پانا کھٹکے کی بات ہے)[۵۲]

سفرِ حج وزیارت | جب مفتی صاحب کی عمر عربی حساب سے ترسٹھ[۵۳] سال کے قریب پہنچی تو انھوں نے فریضۂ حج ادا کرنے کا قصد کیا، اس سے قبل ایک دفعہ وہ سخت علیل ہو گئے تھے، حالت آخری ہو گئی تھی کہ خواب میں ان کو بشارت ملی کہ ان کی موت حالتِ سفر میں ہو گی[۵۴]

۱۲۸۵ھ/۶۷-۱۸۶۸ء میں وہ اپنی پوتی کے عقد میں جو مولانا عبد الحی کے ساتھ ہوا، فرنگی محل میں آخری بار آئے اور تقریباً چھ مہینے قیام کر کے جون پور واپس گئے[۵۵]۔

شعبان ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کے آخر میں جون پور سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے اور پہلی رمضان کو بحری جہاز

سے بمبئی روانہ ہوکر آخر رمضان میں جدہ پہنچے، وہاں ایک مہینہ قیام کرکے آخر شوال میں مدینہ منورہ روانہ ہوئے، راستے میں علالت اسہال کبدی شروع ہوگئی، مدینہ منورہ میں حاضری نصیب ہوگئی اور جوارِ رسول (علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم) میں ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء کو وفات پائی اور جنت البقیع میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔[21]

بیان کرتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد مدینہ شریف کے ایک بزرگ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی کہ آپ فرما رہے ہیں کہ اس شخص (مرحوم مفتی صاحب) نے جوانی سے مرتے دم تک کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا"۔[22]

تصانیف مفتی صاحب کی متعدد مفید اور مضامینِ انیقہ پر مشتمل تصانیف ہیں :-

(۱) شرح سلم ملا حسن پر حواشی (۲) شرح سلم قاضی مبارک پر حواشی (۳) شمس بازغہ پر حواشی، (۴) ملا حسن کے شمس بازغہ پر حواشی کا تکملہ (۵) ابن سینا کی تصنیف کتاب الشفاء کے طبعیات پر حواشی جو ناتمام رہے (۶) شرح وقایہ جلد اول کے ابتدائی حصے پر حواشی[24] ...... (۷) تفسیر بیضاوی پر حواشی (۸) صحیح بخاری پر حواشی[25]

اہل و عیال مفتی صاحب کا عقد مولانا عبدالواحد (ملا بحر العلوم کے پوتے کی بیٹی سے ہوا، جن سے ایک بیٹے محمد مہدی اور دو بیٹیاں ہوئیں، بیٹیوں کا عقد خاندان ہی میں ہوا، ایک کا مولوی محمد فصیح اللہ اور دوسری کا مولوی محمد انعام اللہ، فخام و نجم کے ساتھ، بیٹے محمد مہدی نے جن کی کنیت "ابوالجیش" تھی درسیات کی تکمیل والد ماجد ہی سے کی، سلطنت اودھ میں مفتی عدالت کے منصب پر کچھ عرصے اپنے والد ماجد کی قائم مقامی کی، انگریزی حکومت کے زمانے میں رجسٹراری کے محکمے میں ملازم ہوئے[26] اور ان کا عقد مولانا عبدالحکیم (ملا بحر العلوم کے پوتے) کی بیٹی سے ہوا، جن سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے محمد قاسم اور ابو محمد ہوئے، ابو محمد کا انتقال شادی بیاہ سے پہلے ہی ہوگیا، بیٹیوں کا عقد خاندان ہی میں ہوا، ایک کے شوہر نامور

عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی تھے، دوسری کے شوہر مولانا عبدالخالق فرنگی محلی۔

مولانا محمد مہدی کی وفات ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں دریا میں ڈوب کر ہوئی، وہ فیض آباد گئے ہوئے تھے، وہاں ہی یہ حادثہ پیش آیا[27] ــــ ان کی تصنیف و تالیف، درس و تدریس نیز بیعت کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

ان کے بیٹے مولوی محمد قاسم نے اپنے نامور جد مفتی محمد یوسف سے کتب درسیہ پڑھیں، وہ حافظ قرآن بھی تھے[28] ان کے درسیات کی تکمیل اور بیعت وغیرہ سے متعلق کوئی حوالہ نہیں ملتا، ان کا عقد خاندان میں عمدۃ العلماء، مولانا محمد ظہور علی کی بیٹی کے ساتھ ہوا (خاندان کی یہ شاخ حیدر آباد دکن میں بود و باش رکھتی تھی) جن سے ایک بیٹے محمد یوسف بقید حیات رہے، جن کا عرف "مفتی میاں" رکھا گیا، خود مولوی محمد قاسم حیدر آباد دکن میں رہے، بیوی (بنت مولانا محمد ظہور علی) کے انتقال کے بعد حیدر آباد ہی میں انھوں نے دوسرا عقد خاندان سے باہر کیا جن سے اولادیں ہیں، مگر ان کے احوال معلوم نہیں ہوسکے ۲۹. مولوی قاسم کی وفات ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔

حوالہ جات

(۱) مقدمہ عمدۃ الرعایہ از مولانا عبدالحی فرنگی محلی (مطبوعہ عربی)، (۲) تذکرہ علمائے فرنگی محل از مولانا محمد عنایت اللہ (اردو مطبوعہ ص ۱۰۷-۹)، (۳) حیات شبلی از علامہ سید سلیمان ندوی (اردو مطبوعہ ص ۴۳)

(۴) تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی (اردو مطبوعہ ص ۷۶-۵)، (۵) تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی (فارسی مطبوعہ ص ۲۱۸)، (۶) حیات شبلی مذکورہ ص ۴۹، (۷) انوار رزاقیہ از شیخ محمد الطاف الرحمٰن قدوائی (اردو مطبوعہ ص ۵)، (۸) قلمی بیاض از شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (م ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) یہ بیاض مولانا نعیم کے پرپوتے اور جانشین مولوی محمد ناصر مرحوم (م ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء) کے

کے پاس تھی اس سے راقم الحروف نے کچھ چیزیں نقل کر لی تھیں اب یہ بیاض اُن کے گھر سے لاپتہ ہوگئی ہے۔
(۹) مطالعۂ امیر از ڈاکٹر ابو محمد سحر (مطبوعہ اردو ۱۹۶۵ء) (۱۰) تذکرۂ علمائے ہند مذکورہ ص۱۶۱ (۱۱) قطب دائرہ (ترجمہ مولانا شاہ شبیر عطا سلونوی (مطبوعہ) (۱۲) برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل از مولانا محمد عبدالباقی فرنگی محلی مہاجر مدنی (عربی مخطوطہ) (۱۳) مقدمہ عمدۃ الرعایہ مذکورۂ بالا، (۱۴) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورہ بالا (ص۲۰۷) (۱۵) انوار رزاقیہ مذکورہ ص۱۲ (۱۶) انوار رزاقیہ مذکورہ ص۱۱ (۱۷) خیر العمل از مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلی (مخطوطہ عربی) (۱۸) حدیقہ شہدا، ۱. ہنومان گڈھی کی مسجد اور اس کے سلسلہ میں مولانا سید امیر الدین علی شہید امیٹھوی کے واقعہ کے موضوع پر حدیقہ شہدا نہ صرف معاصر تصنیف ہے بلکہ ایسے مصنف کے قلم کی لکھی ہے جو مولانا امیٹھوی شہید سے قربت رکھتا تھا اور اسے مولانائے شہید نے لشکر میں شامل ہونے سے باز رکھتے ہوئے راجدھانی لکھنؤ میں بطور سفیر خاص مقیم رہنے کا حکم دیا تھا، اس کی یہ کتاب اس واقعہ کے سلسلے میں لکھنؤ میں درباری اور عوامی رجحانات کے مشاہدات اور لشکر مجاہدین کی بیرون لکھنؤ سرگرمیوں سے متعلق موصولہ اخبار (بعض تحریرات) پر مشتمل ہے، اس کا نقطۂ نظر از روئے تاریخ غیر جانبدارانہ نہیں کہا جا سکتا ہے تاہم واقعات کے اعتبار سے یہ کتاب مستند ماخذ ہے، مصنف کا نام مرزا جان ہے جو قلمی نام معلوم ہوتا ہے، بچپن میں کانوں میں پڑا تھا کہ مصنف کا خاندانی تعلق شیخ زادگانِ لکھنؤ سے تھا، راقم کے سنِ شعور میں اس خاندان کے ممتاز فرد شیخ شوکت علی وکیل تھے جن کا احاطہ شیخ شوکت علی واقع رکاب گنج آج بھی معروف ہے، کتاب اس سال چھپی جس سال مولانا امیر الدین علی شہید کا واقعہ پیش آیا۔
(۱۹-۲۰) حوالۂ بالا (۲۱) خیر العمل مذکورۂ بالا (۲۲) حوالۂ مذکورہ (۲۳) برکۃ العلم والعمل مذکورۂ بالا (۲۴) خیر العمل مذکورۂ بالا، (۲۵) مقدمہ عمدۃ الرعایہ مذکورۂ بالا، (۲۶) خیر العمل مذکورۂ بالا (۲۷) حوالۂ مذکورۂ (۲۸) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورۂ بالا (۲۹) برکۃ العلم والعمل مذکورۂ بالا (۳۰) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورۂ بالا۔

اشعار و قصائد کی دینی حیثیت

از

مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری. ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر، نیپال

(۲)

شاعر کی قدردانی اور انعام و اکرام مروان بن ابو حفصہ نے معن بن زائدہ کی وفات پر مرثیہ کہا، حاتم وقت جعفر برمکی نے بلا کر پوچھا کہ معن کی اولاد نے تجھ کو اس مرثیہ خوانی پر کچھ دیا، شاعر نے کہا کچھ نہیں دیا، پھر پوچھا کہ اگر معن زندہ ہوتا تو تجھے ان شعروں پر کیا دیتا؟ اس نے کہا کہ تقریباً سو اشرفی، جعفر برمکی نے کہا کہ معن اور زیادہ دیتے، یہ کہہ کر حکم دیا کہ مکان روانہ ہونے سے پہلے ایک ہزار چھ سو اشرفی میرے خزانچی سے لے لینا، (مرآۃ الجنان ج ا ص۳۳۳)

کیسے عجیب و غریب قسم کے سخی و فیاض تھے، آج چراغِ رخ زیبا لے کر ڈھونڈو تو اس کی نظیر سے یہ تاریک دنیا خالی نظر آئے گی،

انعام کی مقدار عظیم خلیفہ مہدی نے مروان بن ابو حفصہ شاعر کو ہر شعر پہ ہزار درہم دیا، اس طرح ستر شعروں پر ستر ہزار درہم نقد حاصل ہوگیا، (مرآۃ الجنان ج اول ص ۳۹)

ایک اور عظیم القدر انعام علامہ یافعی کہتے ہیں کہ ایک عباسی خلیفہ نے صرف ایک بیت پر خوش ہو کر تین لاکھ کی ایک تھیلی شاعر زماں مروان بن ابو حفصہ کو دے ڈالا، (مرآۃ الجنان ص۳۹)

ایک عجیب مدح سرائی پر ایک عظیم انعام یزید بن حاتم (حاکم افریقہ) کی تعریف میں ایک شاعر نے

دو شعر پڑھے ؎

یا واحد العرب الذی … اضحٰی و لیس لہ النظیر
لو کان مثلک اٰخر … ما کان فی الدنیا فقیر

اے عرب کے واحد فرد اور بے مثال شخص، اگر تمہارے مانند کوئی اور بھی دوسرا شخص ہوتا تو دنیا میں کوئی فقیر و محتاج نہ رہ جاتا،

یزید نے اپنے خزانچی کو بلایا اور پوچھا کہ خزانہ میں کتنی رقم ہے، اس نے کہا، سونے اور چاندی کے سکے اور سلیں ملا کر بیس ہزار اشرفی کی مالیت ہے، یہ سن کر خزانچی سے کہا کہ سب ان کو دے دو، شاعر سے کہا:

یا اخی معذرۃ الی اللہ تعالٰی … اے بھائی! یہ میری معذرت قبول
ثم الیک و اللہ لو کان … کرو کہ اس سے زیادہ، میرے پاس
فی ملکی غیرھا المادختہ تھا، … اس وقت کچھ نہیں ہے، ورنہ اگر کچھ
(مرأۃ الجنان ج ۱ ص ۳۹۹) … ہوتا وہ سب کچھ تمہارے حوالہ کر دیتا،

شاعر کی ادنیٰ تحریک پر بیش قرار عطیہ

فیاض زمانہ یحییٰ بن خالد برمکی کا قاعدہ تھا کہ سواری کے وقت جو بھی اس کے سامنے آتا، اس کو دو سو درہم دلواتا، ایک دن ایک شاعر سامنے آ گیا، اس نے یہ دو شعر پڑھے ؎

کل من مرّ فی الطریق علیکم … قلہ من نوالکم مأتان
مأتان درھم لمثلی قلیل … ھی منکم للقابس العجلان

یعنی سر راہ چلتے چلتے مل جانے والوں کو آپ دو سو درہم دے ڈالتے ہیں، مگر مجھ جیسے ضرورتمند کو یہ رقم کافی نہ ہو گی۔ اس پر دو سو کے بجائے بیس ہزار درہم منظور ہو گیا،

بچہ کی ولادت پر مبارکباد اور فضل بن یحییٰ کا اکرام

فیاض زمانہ فضل بن یحییٰ برمکی کے یہاں ایک بچہ تولد ہوا، تو شعراء نے مبارکباد دی، اور اشرفیوں کا انعام حاصل کیا، ایک دمشقی شاعر نے یہ شعر پڑھا:

ویفرح بالمولود من اٰل برمک … ولاسیما ان کان من ولد الفضل

آل برمک کے ہر نوزائیدہ بچے سے لوگ خوش ہوتے ہیں، خاص طور سے جب وہ بچہ فضل برمکی کا ہو، (مرأۃ الجنان ص ۴۳۴)

فضل بن یحییٰ برمکی نے خوش ہو کر اس شاعر کو دس ہزار اشرفی ایک شعر پر دے دیا،

اشعار سے عبرت پذیری اور قدر دانی

خلیفہ متوکل سے کسی شخص نے شکایت کی کہ امام ابو الحسن عسکری خلافت کی تمنا رکھتے ہیں، یہ سن کر خلیفہ متوکل نے فرمایا، خفیہ چھاپہ مار جس حالت میں ہوں، ان کو اسی حالت میں حاضر کرو، وہ بال کا کرتہ پہنے ہوئے تھے، اور سوت کی چادر پر بیٹھے ہوئے تھے، اور قرآن پاک کی آیات کو ترنم سے پڑھ رہے تھے، اسی حال میں خلیفہ متوکل کے سامنے حاضر کیے گئے، خلیفہ نے ان سے کہا، انشدنی شعراً، مجھے کوئی شعر سناؤ، امام عسکری نے فرمایا کہ میں اشعار بہت کم جانتا ہوں، خلیفہ نے کہا، کچھ نہ کچھ ضرور سنانا ہو گا، تو ان اشعار کو سنایا:

نادا ھم صارخ من بعد ما قبروا … این الاسرۃ والتیجان والحلل
این الوجوہ التی کانت منعمۃ … من دونھا تضرب الاستار والکلل
فافصح القبر عنھم حین سائلھم … تلک الوجوہ علیھا الدود یقتتل

یعنی کسی نے قبر میں جانے والوں سے پوچھا کہ تخت و تاج اور شاہی لباس و حلے کیا ہوئے، اور ناز و نعم میں پلے ہوئے چہرے جن کے سامنے پردے اور حجاب لگے رہتے تھے کہاں گئے، تو قبر نے کہا کہ دیکھو یہ چہرے موجود ہیں، اور کیڑے مکوڑے ان پر دوڑ رہے ہیں،

متوکل ان اشعار سے متاثر ہو کر دیر تک روتا رہا، یہاں تک کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی پھر پوچھا کہ تم پر کچھ قرض ہو تو ادا کر دیا جائے، انہوں نے کہا، چار ہزار اشرفی مجھ پر قرض ہے، متوکل نے چار ہزار اشرفی دے کر ان کو عزت سے رخصت کر دیا، (مراٰۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۱)

ایک شعر کے ذریعہ التماس اور فی الفور انتظام

سیف الدولہ کے پاس مقام "حلب" میں قاضی ابو نصر نیشاپوری آئے اور یہ شعر پڑھا:

جنابک معتاد وامرک نافذ	وعبدک محتاج الی الف درھم

یعنی آپ کی خدمت میں سب کی حاضری ہوتی ہے، اور آپ کا حکم سب کے لیے جاری ہوتا ہے آپکا یہ خاکسار خادم ہزار درم کے لیے ضرورتمند ہے،

قاضی صاحب کے اس سادہ التماس پر سیف الدولہ ہنسنے لگا، اور ایک ہزار درم فی الفور مولانا کے حوالہ کیا، (مراٰۃ الجنان ج ۲ ص ۳۶۳)

نضر بن شمیل کے ایک لفظ کی اصلاح پر عظیم الشان انعام

نضر بن شمیل بصری حدیث، لغت اور نحو کا امام گذرا ہے، ایک بار خلیفہ مامون رشید نے لفظ سداد کو غلطی سے سَداد بالفتح پڑھا، تو نضر بن شمیل نے سِداد بالکسر بتا کر اصلاح کی، اور استدلال میں عرب جاہلیت کا ایک شعر پیش کیا، مامون نے اصلاح کو صحیح سمجھ کر بخوشی پچاس ہزار درم انعام دیا، (مراٰۃ الجنان ص ۱/۲۷)

شعراء کی عجیب قدردانی

مراکشی نے معجب میں شعراء کی قدردانیوں کے سلسلہ میں ایک عجیب روایت نقل کی ہے، کہ عربی زبان میں شعر کہنے والوں کو صلہ اور انعام دینے کے لیے اندلس کے بعض امیروں نے اپنی زمینیں وقف کر رکھی تھیں، مساجد و مدارس جیسے متبرک مقامات کے لیے اوقاف تو مسلمانوں کا عام معمول رہا ہے، لیکن شعراء کے مصارف و انعامات کے لیے اوقاف تو اندلس ہی کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے،

محدثین کی شعری واقفیت

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا چرچا نہ پھیلتا، سفیان ثوریؒ نے شعبہ کی وفات کے موقع پر فرمایا مات الحدیث، یعنی آج علم حدیث کا انتقال ہو گیا ہے، وکان رأسا فی العربیۃ والشعر، یعنی یہ محدث یگانہ شعر و ادب میں بھی ممتاز تھے، (مراٰۃ الجنان ج ۱ ص ۱۴۱)

علم فقہ و فن شعر

امام محمد بن حسنؒ شیبانی کا بیان ہے کہ میرے باپ نے تیس ہزار درم چھوڑا تھا، اس میں سے پندرہ ہزار درم نحو اور شعر کی تحصیل پر میں نے صرف کیا، باقی علم فقہ پر، (مراٰۃ الجنان ج ۱ ص ۳۴۳)

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین و فقہا بھی شعر گوئی میں وقت صرف کیا کرتے تھے،

امام شافعیؒ کی شعری مہارت

علم حدیث و فقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ علم ادب و شعر میں، امام شافعیؒ کو کمال حاصل تھا، ادب کے ماہرین آتے اور اشعار ان سے حل کراتے، ہذیل شاعر کے دس ہزار اشعار آپ کو زبانی یاد تھے، (مراٰۃ الجنان ج ۱ ص ۱۹)

اسی طرح جب خلیفہ ہارون رشید نے امام شافعیؒ سے قرآن و حدیث کے سوال و جواب کے بعد شعروں کے متعلق پوچھا کیف معرفتک بالشعر، تو جواب دیا کہ ہر نوع و ہر بحر کے اشعار سے واقف ہوں، (مراٰۃ الجنان ج ۱ ص ۲۱)

کسی نے امام موصوف سے کہا کہ فقیہ مصر اشہب آپ کے لیے موت کی دعا کرتے ہیں، اس پر آپ نے بداہۃً یہ شعر پڑھا:

تمنی رجال ان اموت وان امت	فتلک سبیل لست فیہا باوحد

(مراٰۃ الجنان ج ۱ ص ۴۴)

کچھ لوگ میری موت کی تمنا کر رہے ہیں، حالانکہ موت تو سب ہی کو آتی ہے، اگر میں بھی مر گیا تو میں اس راہ میں منفرد نہ ہوں گا،

تحصیل علم کے سلسلہ میں امام شافعیؒ کے حسب ذیل اشعار نہایت نصیحت آموز ہیں، وہ فرماتے ہیں،

ومن لم یذق ذل التعلیم ساعۃ — تجرع ذل الجھل طول حیاتہ

یعنی جو شخص علم سیکھنے کے لیے ایک گھڑی کی ذلت برداشت نہیں کرتا، وہ ساری عمر جہالت کی رسوائی کے گھونٹ پیتا رہے گا،

ومن فاتہ التعلیم وقت شبابہ — فکبر علیہ اربعًا لوفاتہ

یعنی جو شخص اپنی جوانی کے وقت علم حاصل نہ کرسکا تو اسے مردہ سمجھ کر اس پر جنازہ کی چار تکبیریں کہو،

حیاۃ الفتیٰ واللہ بالعلم والتقیٰ — اذا لم یکونا لا اعتبار لذاتہ

یعنی قسم بخدا انسان کی زندگی قابل قدر علم و تقویٰ کے ساتھ ہے، لیکن جب انسان میں علم اور تقویٰ نہ ہو تو اس کی ذات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، (ملاحظہ ہو آداب الشافعیؒ ومناقبہ)

امام شعبی کا حافظ القصائد ہونا، امام شعبی فرماتے ہیں ما احفظ اقل من الشعر ولو شئت ان انشدکم شھرا ولا اعید بیتا لفعلت، یعنی میں تھوڑے اشعار کا حافظ نہیں ہوں، اگر میں چاہوں تو مسلسل ایک ماہ شعروں کو سناتا چلا جاؤں، اور کوئی شعر مکرر نہ آنے پائے، (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۲۱۷)

ابو بکر ہذلیؒ سے امام شعبیؒ نے پوچھا کہ تمہیں شعروں کا ذوق ہے؟ کہنے لگے کہ ہاں، اس پر امام شعبیؒ نے فرمایا کہ اشعار کو علمائے فحول اور ہمارے اکابر پسند کرتے آئے ہیں، (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۲۱۷)

امام شعبیؒ کو امرؤ القیس، زہیر، نابغہ، عدی بن زید، طرفہ بن عبید کے اشعار حفظ تھے،

خواجہ جنیدؒ کے عارفانہ اشعار حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ نے حضرت سری سقطیؒ کے پاس ایک رقعہ بھیجا، اس میں لکھا ھذہ خیر لک من سبعمائۃ قصۃ یعنی یہ

اشعار سات سو قصوں سے بہتر ہیں،

ولما ادعیت الحب قالت کذبتنی — فمالی أری الاعضاء منک کواسیا

یعنی دعوائے محبت غلط ہے جب تک کہ اعضاء گل نہ جائیں،

فما الحب حتی یلصق الظھر بالحشا — وتذبل حتی لا تجیب المنادیا

یعنی محبت کی پہچان یہ ہے کہ پیٹھ پیٹ سے چپک جائے، اور اس قدر دبلا لاغر ہو جائے کہ کسی پکارنے والے کو جواب نہ دے سکے،

وتنحل حتی لیس یبقی لک الھوی — سوی مقلۃ تبکی بھا وتناجیا

اور اس طرح گل جائے کہ محبت سوائے رونے والی آنکھ کے کسی چیز کو باقی نہ چھوڑے

سلطان محمود کے دربار کے شعراء و علماء؛ سلطان محمود اہل علم کا بڑا مربی تھا، وہ شعراء کے کلام اور علماء کی گفتگو کو بڑے شوق سے سنتا تھا، اور اس کی سرپرستی کی وجہ سے مشہور شاعروں اور ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ اس کے گرد جمع ہوگیا تھا، ایشیا کے ہر حصے سے اہل علم اس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے، شعراء اس کی مدح میں قصائد کہتے، اس کو خود بھی شعر و شاعری کا کچھ ایسا ذوق ہو گیا تھا کہ بڑی سی بڑی مہم میں بھی وہ تھوڑا سا وقت اچھی غزل اور اچھی رباعیات سننے کے لیے ضرور بچا لیتا تھا، اس زمانہ کے جتنے ممتاز اور جید اہل علم تھے، سب اس کے گرد جمع ہوگئے تھے، ان میں البیرونی جیسا مشہور ریاضی داں اور ماہر ہیئت اور سنسکرت کا عالم بھی تھا، عتبی اور بیہقی جیسے مورخ بھی تھے، اور فارابی جیسا فلسفی بھی تھا، یہ شعر و شاعری کا دور تھا، اور محمود کے دربار کے شعراء کی شہرت تمام ایشیا میں پھیلی ہوئی تھی، ان شعراء میں غفاری کو سلطان محمود نے ایک چھوٹے سے قصیدہ کے صلہ میں چودہ ہزار درم دیئے تھے، اور عنصری اس عہد کے سب سے باکمال شاعر تھا، تاریخ فرشتہ کا بیان ہے کہ چار سو شعراء و علماء، نیز غزنین کے جامعہ کے طلبہ عنصری کی

شاگردی کا دم بھرتے تھے، اسدی، طوسی، عسجدی اور فرخی بھی محمود کی فیاضیوں سے سیراب ہو رہے تھے، (بحوالہ مڈیول انڈیا مؤلفہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد معارف اعظم گڈھ دسمبر ۵۱ء)

تیموری بادشاہوں اور شاہزادوں کا ادبی ذوق، ان کے دربار کے فضلاء و شعراء کی قدردانیوں کا مفصل حال بزم تیموریہ مؤلفہ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن میں پڑھیے،

ریاست حیدر آباد کی قدر دانی شعر

حیدر آباد کے قطب شاہی عہد میں تلنگی شعراء انعام و اکرام اور اشرفیوں اور دو[2] شالوں سے نوازے جاتے تھے، چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے کہ میرے جسم کو معطر کیا گیا، اور ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کی شال میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی اور لعل سے بھرا ہوا جواہرات کا ایک ڈبہ مجھے دیا گیا، اس کے بعد نظم سنانے کی فرمایش کی گئی،

(۲) مرزا لطف علی دہلوی اسی دور میں حیدر آباد آیا تھا، ارسطو جاہ نے اسے تعظیم و توقیر کے ساتھ اپنا مصاحب بنالیا، اور دربار شاہی میں پیش کر کے چار سو[۴۰۰] ماہوار اور پالکی سے سرفراز کیا، علی لطف نے آصف جاہ ثانی اور ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدے لکھے، اور انعام و اکرام سے نوازا گیا،

(۳) مرزا علی لطف دہلوی کی طرح مرزا قمر الدین منت بھی حیدر آباد آئے تھے، اور آصف جاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس پر دس ہزار نقد اور دو سو[۲۰۰] روپے ماہانہ کا منصب ان کو عطا کیا گیا،

(۴) دہلی کے ایک جگت استاد شاہ نصیر الدین نصیر کو چندو لال نے چوتھی بار ۱۲۵۴ھ میں سات ہزار روپے سفر خرچ بھیجکر طلب کیا، اور پچیس[۲۵] روپیے یومیہ مقرر کر دیا، انعام و اکرام اس کے علاوہ تھا، شاہ نصیر آخر کار حیدر آباد ہی میں رہ گیے،

(۵) شیخ حفیظ دہلوی جب حیدر آباد پہنچے اور مہاراجہ کی بارگاہ میں قصیدہ پیش کیا، تو انھوں نے ان کو خلعت اور ہزار روپیہ ماہوار سے سرفراز کیا، انھوں نے اپنی خوش کلامی اور جادو بیانی سے خواص و عوام کو مسخر کر لیا، وہ ملک الشعراء سمجھے جاتے تھے، نازک دماغ اور خوش مذاق اس قدر تھے کہ ہر روز ایک نیا لباس پہن کر دربار میں حاضر ہوتے، سکندر جاہ کے دربار میں باریاب ہوئے تو یہ رباعی نذر گذاری ؎

کوئی نام خدا لیکے حرم تک پہونچا   کوئی پوجتے ہوئے دیر صنم تک پہونچا

خوش طالعی میری کہ لے کر میں نذر   تجھ جیسے سکندر کے قدم تک پہونچا

مہاراجہ کشن پرشاد کی قدردانی کی تعریف

جہ می پرسی مہاراجہ جہاں داشت ٭ نشانِ مجد و آثار و علاء داشت

بایں دریا دلی بذل و سخا دست ٭ ز دست کوتہ خود ناجہا داشت

علامہ اقبال نے ان کی تعریف میں لکھا ہے:

آستانے پہ وزارت کے ہوا میرا گذر   بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری   چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

اس کے فیضِ پاک منت خواہ کان محل خیز   بحر گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

نواب والا جاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم و مغفور کے دربار میں شکیل، جلیل دو نامی گرامی شاعر تھے، نواب صاحب ان کی بڑی قدردانی فرماتے، نواب صاحب کی کتابوں پر اکثر ان کی تقریظات ہیں انکے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ٹوٹ پڑتا نہیں کس واسطے یارب یہ فلک   کیوں زمیں شق نہیں ہوتی یہ تماشہ کیا ہے؟

حائل منزل مقصود ہیں قطاع طریق   نقد ایماں کے تحفظ کا طریقہ کیا ہے؟

فکر بے دینوں کو بس یہ ہی کہ ہر پہلو سے   مال دنیا کا لے دولت عقبیٰ کیا ہے؟

یارب اس دورِ پر آشوب میں ایمان قائم — تو ہی رکھے تو رہے ورنہ بھروسہ کیا ہے
کس لیے مہدیٔ موعود کو ظاہر نہیں کرتا — دیر عیسیٰؑ کے اترنے میں خدایا کیا ہے؟

قادیانیوں کا جب اول اول فتنہ اٹھا ہے، تو اس وقت یہ اشعار کہے گئے تھے، جو خاصے طویل ہیں،

علمائے اسلام کی اشعار سے دلچسپی

علمائے دین، صوفیائے کرام، مشائخ زمانہ ہر دور میں شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے ملیں گے، جو منتخب اشعار کو پسند فرماتے، اور موقع موقع سے ترنم فرماتے، اس قسم کے واقعات کو جمع کرنا مشکل اور طول کلام کا باعث ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی بیش قیمت تصنیف درر کامنہ میں اور علامہ ابن الجوزیؒ نے صفوۃ الصفوۃ میں اور علامہ یافعیؒ نے مرآۃ الجنان میں بزرگان دین و شیوخ اسلام کے حالات کے سلسلہ میں ان کی تصانیف اور ان کے منتخب اشعار سے اپنی کتابوں کو مزین کیا ہے، دور آخر کے علمائے محدثین میں شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ ادب و شعر پر عبور رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے مولانا فضل حق خیرآبادیؒ کے عربی اشعار و قصائد پر بارہا اصلاح دی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "اطیب النغم" ان کے شعری ذوق پر خود شاہد عدل ہے، شیخ سعدیؒ کی گلستاں و بوستاں کے اشعار و قطعات و رباعیات، اور مولانا رومی کی مثنوی اور خواجہ حافظ کے دیوان حافظ سے اہل علم و فضل ہمیشہ سے صحیح ذوق اور وابستگی رکھتے رہے ہیں، ہمارے دور آخر میں ہندوستان میں ایک بڑی نامی گرامی ہستی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دیوبند کی ہے، آپ کو بھی شعر و شاعری سے اچھا خاصا لگاؤ تھا، ادبائے دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے رسالہ دارالعلوم میں جو مضمون شائع ہوا تھا، اس میں مولانا نانوتویؒ کے اشعار بہت نقل ہوتے رہے ہیں، دو شعر ہدیۂ ناظرین ہیں:

وہ پیار کی باتوں میں خفا ہو گیا یارب — امید کرم ہم کو بھی کچھ اور زیادہ

کچھ ناز کا دعویٰ ہے اگر اپنا ہی سمجھ کر — تو ہاں تمہیں اپنی ہی قسم اور زیادہ

معارف میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ شارح مسلم کی وفات حسرت آیات پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے وفیات کے ذیل میں جب ان کا ذکر جمیل کیا، تو اس میں ان کے کمال خطابت اور زور تقریر سے متعلق یہ تحریر کیا تھا کہ وہ اسلام کے مسائل، عقل و حکمت کے مباحث کو بیان کرتے کرتے اکثر شاعر ملت اکبر الہ آبادی کے اشعار کو اس طرح موزوں اور حسب حال پڑھ دیتے کہ پوری تقریر میں ایک جان سی پڑ جاتی گویا یہ شعر شاعر نے اسی موقع کے لیے کہے تھے۔

ان کے تفسیری حاشیہ میں جا بجا ایسے اشعار موجود ہیں جو آیات و احکام کے مضمون متعلقہ پر روشنی ڈالتے ہیں،

ہمارے دور آخر کے بزرگ علماء میں سید الطائفہ حضرت مولانا سید احمد شہید رائے بریلویؒ اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی عظیم ہستیاں ہیں، ان کے مخلص رفقاء جب جزیرہ انڈمان میں قید تھے، تو یہ رفقاء ان حضرات کی یاد میں یہ شعر بڑے درد و سوز سے پڑھتے تھے

اتنا پیغام درد کا کہنا — جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے — دن بہت انتظار میں گذرے

شیخ العرب والعجم محدث یگانہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کا حفظ اشعار

استاد الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا صحیح غزنویؒ کے مضامین و معارف کی تلقین کرتے ہوئے درس حدیث کے درمیان موزوں شعر پڑھا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ سے ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خفا ہو گئے، تو حضرت عائشہؓ نے وہی مضمون ادا کیا جو ایک شاعر نے باندھا ہے، یہ کہہ کر مولانا سید نذیر حسینؒ نے وہ شعر سنایا،

آخر اے آہوئے مشکیں کہ رسیدی از ما　　چہ خطا رفت و چہ کردیم چہ دیدی از ما

حضرت مولانا سید عبدالحئی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے اپنے ایک سفرنامہ میں شیخ الکل والعجم حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی ملاقات اور ان کے درس حدیث کی مجلسوں میں اپنی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ شرح حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور بعید ظرافت و خوش طبعی سے درس دیا کرتے تھے، اور ساتھ ہی کثرت سے موقعہ بموقعہ اشعار پڑھتے جاتے تھے،

علمائے ہند میں ایک بزرگ عالم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (صاحب بذل المجہود) بہ سلسلۂ حج جب مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو حاضر ہوئے، وہاں کے پاک مناظر نے ان کے دل پر ایک گہرا اثر کیا، چنانچہ ایک پاکیزہ شعر کے ذریعہ اپنی عقیدت مندی و تاثر کو ظاہر کیا ہے:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

(فضائل حج مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

مظاہر قدرت و مناظر فطرت کی دلکش مصوری اور لطیف احساسات و نازک جذبات کے اظہار ہی کا نام شعر و شاعری ہے، محدث یگانہ، فاضل اجل مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی اور علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی سلیمان پٹیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی شعر و ادب سے مکمل واقفیت اور ان کے ذوق صحیح سے کون انکار کر سکتا ہے، حمد و نعت، مدح وغیرہ پر ان کے اشعار و قصائد ان کی کتابوں میں موجود ہیں،

ہمارے بزرگ پیر و مرشد، محدث یگانہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ صاحب تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی جیسے فاضل بے بدل اور عالم بے مثال تھے، وہ ایک دنیا کو معلوم ہے، آپ وعظ کم فرماتے لیکن جب وعظ فرماتے تو موقع بہ موقع اشعار پڑھ کر وعظ کو بہت موثر اور دلنشیں کر دیتے،

شاہ محب اللہ الہ آبادی

از

جناب مسعود انور علوی کاکوروی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

شاہ محب اللہ الہ آبادی عہد شاہجہانی کے ایک مشہور عالم، مذہبی مفکر اور صاحب نسبت و حال بزرگ تھے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کے موئد اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی (۵۶۰/۱۱۶۵ء تا ۶۳۸/ ۱۲۴۰) اور ان کی تصانیف کے پرزور حامی و ہمنوا تھے۔ ان کی شخصیت بڑی مختلف فیہ رہی ہے، علمائے ظاہر کا ایک بڑا گروہ ان کو ملحد و گمراہ قرار دیتا رہا ہے جس کی وجہ غالباً یہی رہی کہ ان کی تصانیف ان کے عقائد سے مختلف فیہ تھیں۔ لیکن اس کے برعکس بیشتر صوفیائے کرام نے ان کو عارف باللہ اور اسرار و معارف کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

ولادت و نسب ۲ صفر بروز دوشنبہ ۹۹۶/ ۱۵۸۷ء کو صدرپور ضلع خیرآباد میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر تک اس طرح پہنچتا ہے۔ شاہ محب اللہ (۱) بن مبارز (۲) بن پیر (۳) بن بڈھی (۴) بن منجھی (۵) بن قاضی رضی الدین (۶) بن اوحدالدین (۷) بن مجدالدین (۸) بن جمیل الدین (۹) بن رفیع الدین (۱۰) بن محب اللہ (۱۱) بن رسم اللہ (۱۲) بن حبیب اللہ (۱۳) بن ابراہیم (۱۴) بن علاؤالدین (۱۵) بن قاسم (۱۶) بن عبدالرزاق (۱۷) بن عبدالقادر (۱۸) بن ابوالفتح (۱۹) بن عبدالسلام (۲۰) بن جعفر (۲۱) بن شہاب الدین (۲۲) بن حضرت فریدالدین مسعود عمری رحمۃ اللہ علیہ،

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم صدرپور میں حاصل کی، پھر مزید تعلیم کے واسطے لاہور گئے وہاں

[1] نزہۃ الخواطر۔ علامہ سید عبدالحئی الحسنی، ۵ : ۳۲۳

امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد مفتی عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۷ھ/۲۸-۱۶۲۷ء) سے جملہ علوم کا اکتساب کیا۔ مفتی عبدالسلام دیوی، شیخ محمد میر سائین سیوستانی اور سعد اللہ خان تمیمی چنوتی بھی ان کے ہم سبق رہے، جب سعد اللہ خان (۱۰۶۶ھ/۵۶-۱۶۵۵ء) کو حکومت کی جانب سے دہلی میں وزارت کا عہدہ تفویض ہوا تو انھوں نے اپنی سابقہ دوستی کی بنا پر شاہ صاحب موصوف اور شیخ محمد میر کو دہلی بلایا۔ شیخ محمد میر نے تو گوشۂ عافیت و تنہائی کو ترجیح دی اور انکار کردیا لیکن شاہ صاحب دوست کی طلبی پر دہلی آگئے۔

مؤلف بحر ذخار لکھتے ہیں۔

"از وقت حضرت گنج شکر تا او کسے از اجدادش میل و رغبت بہ دنیا نہ کردہ در زمانہ ہائے خود سوائے از تحصیل علوم صوری و معنوی کار نداشتہ اند و بعنوان جوانی شیخ از وطن خود قصبہ صدرپور کہ توابع خیرآباد از مضافات اودھ است باکتساب صوری دانش بہ لاہور رفت و بپایۂ تکمیل رسانیدہ بہ دہلی رفت سعد اللہ خاں وزیر از وقت طالب علمی آشنائے آنحضرت بود خواست کہ او را از منصب مناسب سلطان بہرہ ور گرداند[1]"

سعد اللہ خان کی طلبی پر دہلی آئے تو ضرور مگر دل میں طلب حق کی امنگ تھی صاحب مرأۃ الاسرار لکھتے ہیں۔

"چوں از تحصیل علم عقلی و نقلی فارغ شد او را ورد طلب حق پدید آمد و اکثر بزرگان وقت را دریافت لما حال اخلاص درست نگشت از غایت سوز طلب در دہلی رفت[2]"

بہت سے صاحبان حال کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر کسی نے کشود کار نہ ہوا، ایک روز حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر مراقب ہوتے وہاں سے حکم ہوا کہ گنگوہ جاؤ اور مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری کے سلسلۂ طریقت کے مشہور بزرگ شیخ ابوسعید گنگوہی (۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء) سے (جو شیخ جلال تھانیسری

[1] بحر ذخار (قلمی)، شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، مخزونہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری موح ۱۰، صفحہ ۵۲۸

کے نواسے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ہیں) بیعت کرو۔

شیخ وجیہ الدین اشرف رقم طراز ہیں۔

"آنحضرت از روح پرفتوح حضرت قطب الاسلام بختیار اوشی ایماشد کہ درین وقت سلسلۂ شیخ علی صابر گرم است بہ گنگوہ برو طریقہ بیعت و اجازت پیش گیر پس او بموجب تمنائے زیارت پازدہ بہ گنگوہ رفت۔ شب مرشدش از کشف آمدش دریافتہ بود بہ خادم حکم نمود کہ برائے وضو و نماز صبح دو آفتابہ پر از آب گرم حاضر کن و طعامے معمولی کہ برائے درویشان پختہ می شود فردا کہ تناول حاضر خواہی ساخت اند کہ در شب باقی ماندہ بود کہ آنحضرت رسیدہ و در مرشد را دید۔ شیخ ابوسعید آب و با انطلاقات کردہ وضو کنانیدہ در میان سنت و فرض فجر بہ شرف بیعت او را مشرف ساخت و طعام را تقسیم حضار ساخت و بعد از کار روشغل خاندان تلقین نمودہ[1]"

مرشد برحق کی خدمت میں رہ کر ایک عرصہ تک ریاضات مجاہدات کئے اجازت خلافت اور خرقہ بھی حاصل کیا، اس کے بعد اپنے وطن صدرپور واپس آئے کچھ عرصہ صدرپور میں رہے پھر شیخ احمد عبدالحق ردولوی (۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء) کے مزار پرانوار کی زیارت کے لئے ردولی ضلع بارہ بنکی گئے۔ صاحب مرأۃ الاسرار اس سفر سے واپسی پر ان کے ہمراہ تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"بعد از چند مدت بہ قدم توکل و تجرید از خانہ برآمدہ بہ جہت دریافت سعادت زیارت خانۂ قبلہ گاہے شیخ محمد عبدالحق قدس سرہ در قصبہ متبرکہ ردولی رسید اتفاقاً ایں فقیر نیز آنجا بود از راہ دلی او در منزل فقیر فرود آمد و صحبت گرم و مصفا واقع شد اطوار پسندیدہ او را مشاہدہ نمودہ بسیار محظوظ شدم پس بعد از چند روز جانب حضرت مخدومی قبلہ گاہے قدس سرہ نوازش و بشارت رخصت یافت و باتفاق یکدیگر از ردولی روانہ شدہ بجا رسید۔ چند روز بسبب الفت و محبت و یگانگی در فقیر خانہ توقف واقع شد[2]"

[1] بحر ذخار ص ۵۲۸ [2] مرأۃ الاسرار۔ مخطوط

میر سید عبدالحکیم ہنسی سے ان کے بہت مراسم تھے۔ چنانچہ ان کی خدمت میں رہ کر ظاہری و باطنی فیوض حاصل کئے بعدہ پور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد پیر و مرشد کے حکم سے الہ آباد روانہ ہوگئے۔ راہ میں مخدوم شیخ حسام الدین مانکپوری کے مزار پر حاضر ہوئے، وہاں کے صاحب سجادہ شاہ جلال الدین نے مخدوم صاحب کے حکم باطنی کے بموجب ایک دستار اور ڈیڑھ روپے نذر کئے۔

مولف بحر زخار نے مرشد برحق کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت، ردولی سے روانگی اور الہ آباد کے سفر کا حال اس طرح درج کیا ہے۔

"بہ اربعین شاہ چلہ تمام نشدہ بود دو روزے شیخ بر در چلہ آمدہ آواز داد اے محب اللہ آنحضرت جواب داد کہ محب اللہ بہ کجاست فرمود کار تمام شد از حجرہ بروں شو احتیاج اتمام چلہ نیست پس از حجرہ برآمد چندے در خدمت پیر ماند اکثر از زبان شیخ برآمدے محب اللہ الہ آبادی پس بامداد خرقۂ خلافت و نعمت و امانت و وصایائے دل پسند کردہ رخصت وطن داد او بقصد پور رسیدہ بعد چندے عازم الہ آباد شد چوں بمانکپور رسید بشرف زیارت شیخ حسام الدین مانکپوری مشرف شد بموجب امر باطن شیخ حسام الدین شاہ جلال الدین سجادہ نشین دستار سر و دو روپیہ نقد بآنحضرت پیش آورد از آں دستار سر افتخار بفلک رسانیدہ و نقدیہ کیسہ کردہ الہ آباد رفت۔"[1]

الہ آباد میں قیام کرنے کے بعد شروع میں بڑی تنگدستی اور فاقہ کی صورت رہی لیکن ان کے پایۂ استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ولایت کی شہرت شروع ہوئی، لوگ جوق در جوق اکتساب فیض کے لئے آنے لگے۔ دارا شکوہ خاص ارادتمندوں میں ہوا۔ حقائق و معارف کے بیانات میں ید طولیٰ تھا تقریریں ایسی موثر و دلنشین ہوتی تھیں کہ وحدت الوجود کے مخالف اور منکر علماء میں سے اکثر ان کے فیض صحبت کے قائل ہوگئے اور یہی مسلک اختیار کیا۔

۱ بحر زخار ۵۲۸

"و در بیان حقائق و معارف دستگاہ تمام بہم رسانید و سخن او فیض بخش گردید اکثر علمائے فحول کہ از مشرب ارباب توحید انکار داشتند بفیض صحبت او تربیت جمال مشرب خاص اختیار نمودند"[1]

تقریباً بیس سال الہ آباد میں مقیم رہے ہزاروں کو فیض پہونچایا۔ بالآخر ۹ رجب المرجب ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء کو وصال فرمایا اور الہ آباد میں مدفون ہوئے۔

"قریب بیست سال در شہر الہ آباد بر مسند ارشاد مستقیم بود بتاریخ نہم ماہ رجب روز پنجشنبہ برابر غروب آفتاب در سنہ یکہزار و پنجاہ و ہشت ہجری بعالم بقا خرامید در شہر مذکور مدفون گشت"[2]

ان کے کافی خلفاء تھے۔ ان میں شیخ قاضی گھاسی (سب سے پہلے مرید) شیخ محمد سولدار، قاضی یوسف، قاضی عبدالرشید، میر سید محمد قنوجی اور شیخ احمد وغیرہ مشہور ہوئے۔ اخلاف میں صرف ایک بیٹے کا پتہ چلتا ہے جن کا نام شیخ تاج الدین تھا۔

"یک پسر خورد سال شیخ تاج الدین نام عقب گذاشت"[3]

تصانیف شاہ محب اللہ صاحب نے اپنے مکتوبات کے علاوہ فارسی و عربی تصانیف کی ایک بڑی تعداد چھوڑی جو مسلک وحدت الوجود کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں حقائق و معارف کے دقیق سے دقیق مسئلے بھی موجود ہیں۔

بحر زخار کے مؤلف رقم طراز ہیں۔

"و از تصانیف حقائق و توحید بسیار است کہ خزینۂ دقائق و گنجینۂ حقائق اسرار الہیست [illegible] و مقامات آں کتب صریح اجتہادش بر مشرب صوفیہ و اہل صفا مشرف است لہذا شیخ محی الدین ابن عربی را شیخ اکبر می گویند و اے را شیخ کبیر لقب می کنند"[4]

شیخ اکبر کی عظمت و رفعت اور ان کی تصانیف کی منزلت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ رسالہ غایت الغایات میں اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

"..... و فقیر کتب اہل اللہ نہ دارد و میل بمطالعہ آں نیارد مگر کتب شیخ مشار الیہ قدس سرہ الالٰہی کہ آں کتب

۱ مراۃ الاسرار (زمانۂ تالیف ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء تا ۱۰۶۵ھ/۱۶۵۴ء) طبقہ بست و یکم ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ بحر زخار ۵۲۷

گویا لوح محفوظ اند و منظور نظر و ملحوظ حبر آں قدس اللہ اسرارہم[1]۔

تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے شاہ صاحب کی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"دانش مند متبحر از مشاہیر علمائے صوفیہ در علوم ظاہر و باطن سرخیل امثال و اقران خود بود[2]"

بحر زخار کے مولف تو آپ کی شان میں یوں رقم طراز ہیں۔

"آں فرماں فرمائے اقلیم طریقت، آں مجتہد کمالات تصوف و حقیقت، آں مرشد و نگار و ہادی

قطب جہانیاں حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی از مشاہیر متصوفان ذوی مناقب و عالم متبحر تصانیفش در

علم تصوف لا تعد و لا تحصی اند[3]۔"

ان کی اکثر تصنیفات شیخ اکبر کی کتابوں کی شرحیں ہیں ذیل میں چند دستیاب شدہ تصانیف کا

ایک اجمالی تعارف درج ہے جس سے ان موصوف کے افکار کا اندازہ ہوگا۔

(۱) ان کے مکتوبات کا ایک نادر نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری (سبحان اللہ ۲۹۷/۱۷) میں موجود ہے۔

متوسط تقطیع میں چار سو تینتیس[۴۳۳] صفحات پر مشتمل ہے اس میں اٹھارہ[۱۸] مکتوبات درج ذیل مختلف شخصیتوں کے نام

ہیں جن میں شیخ اکبر اور فلسفہ وحدت الوجود کی پرزور تائید کی ہے۔ یہ مکتوبات اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں

کہ ان کے ذریعہ شاہ صاحب کے نظریات و افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس نسخہ کے آخر میں درج ذیل عبارت ہے:

"بتاریخ بست و ششم محرم الحرام سنہ ۹ محمد اکبر بادشاہ جہجاہ غازی اتمام گرفت بید احقر طالب علم

شیخ عظیم اللہ بموجب فرمائش مشفق قدر داں خواجہ غلام نقشبند صاحب"۔

ابتدا میں فہرست نہیں ہے۔ مکتوبات درج ذیل ترتیب سے لکھے ہوئے ہیں۔

(۱) ملا محمود جونپوری صفحہ ۱ - ۲۲ (۲) ملا محمود جونپوری صفحہ ۲۲ - ۴۰ (ملا محمود جونپوری (۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) صاحب

شمس بازغہ ہی ہیں جنہوں نے رسالہ تسویہ اور میں عین الایمان لکھی تھی) (۳) شیخ عبدالرشید جونپوری صفحہ ۴۰ - ۱۰۰

(۴) شیخ عطاء اللہ جونپوری صفحہ ۱۰۰ - ۱۳۲ (۵) میر محمد قنوجی صفحہ ۱۳۲ - ۱۳۹ (۶) میر سید عبدالحکیم صفحہ ۱۳۹

لہ رسالہ غایات الغایات مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری (سبحان اللہ کلکشن ۲۹۷/۹۹) ۲ تذکرہ علمائے ہند مولوی رحمن علی (۵) بحر زخار (۵۲)

(۷) شیخ عبدالرحیم صفحہ ۲۱۳ - ۲۸۶ (۸) شیخ تاج محمد صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۷ (۹) شیخ عبدالکریم ۲۸۷ - ۳۱۴ (۱۰) شیخ

عبدالرحمن ۳۱۴ - ۳۲۵ (۱۱) شیخ عبدالرحمن ۳۲۵ - ۳۳۵ (۱۲) میاں شیخ عبدالرحمن رشتی ۳۳۶ - ۳۳۷ (۱۳)

شیخ عبدالرشید جونپوری صفحہ ۳۳۷ - ۳۳۹ (۱۴) شیخ عبدالرحمن صفحہ ۳۳۹ - ۳۶۱ (۱۵) شیخ عبدالرحمن صفحہ

۳۶۱ - ۳۷۷ (۱۶) شیخ عبدالرحیم صفحہ ۳۷۷ - ۳۸۹ (۱۷) شاہزادہ دارا شکوہ صفحہ ۳۸۹ - ۴۲۶ (۱۸) شاہزادہ

دارا شکوہ صفحہ ۴۲۶ - ۴۳۳۔

دارا شکوہ کے نام مکتوبات سے باہمی روابط کا پتہ بھی چلتا ہے۔ شاہ صاحب سے اس کی عقیدت اور

ارادتمندی سے ان کی قدر و منزلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جب الہ آباد کا صوبہ اس کے ذمہ ہوا تو شاہ صاحب کو

خط لکھا کر یہاں آنے کی خوشی صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ جناب والا کا مسکن ہے۔ شاہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ

"دیدہ فرمودہ بودند کہ از گرفتن صوبہ الہ آباد بیشتر خوش حالی بہ وجود است بر صاحب عالم وشن آنست

کہ چوں فقیر بریں ہمہ اخلاق حمیدہ و الطاف کہ صاحب در حقیقت و عین ثابت آں عرفی و ملاذ فقرا بعید

عنایت رحمانی یافتہ نظری کند می گوید کہ ہیچ شاہ و شاہزادہ بہ کمالات صاحب عالم مشرف شدہ

باشد پس زہے سعادت اہل ایں زمانہ کہ مثل تو شاہزادہ و طہارت جنید و صاف پسندیدہ آں جمیع کمالات[1]"

دارا شکوہ کے نام اپنے ایک مکتوب کی ابتداء یوں کرتے ہیں۔

"بندگان ملاذ عارفاں و معاذ جہانیاں عرش پناہ حقائق آگاہ ضابطہ احکام دینی حاوی مراتب

کشفی و یقینی عین الانسان و انسان العین، سلطان عالم صوری و معنوی، برسریر سلطانی و منصہ

شہود حقانی جلوہ گر باشند بعد از طے منازل نیاز مندی و اخلاص و تقطیع مراسم محبت و اختصاص

آنکہ فقیر پیش ازیں بہ کمالات انسانی و مراتب عرفانی آں ملاذ عارفاں محظوظ و خورسند بود و در شکر زمانہ

رطب اللسان کہ الحمد للہ کہ شاہ و شاہزادہ ایں زمانہ صاحب دعارف ربانی اند چوں ایں محبوبانہ

بندگان آنجناب عالی شد نشاط و شکر سابق مضاعف گشت کہ الحمد للہ کہ الحکم عارف سبحانی شدیم[2]"

لہ مکتوبات ۳۸۸ ۲ مکتوبات ۳۸۷

ہندوؤں نے سلوک کرانے کے سلسلہ میں شیخ عبدالرحمن صاحب کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

محقق نماند کہ مخدومی عرفاں پناہ شیخ محمدی دریں ایام سلوک پیش ہندواں می خوانند و ترجمۂ آں می پرسند خود جہاں ہنداں را چہ ... تاں می خوانند چوں ہندواں چیزاں می شوند و اعتقاد درست بحد مست ایشاں پیدا می کنند و حقیقۃ از ان قوم کفرو شرک بیزار می شوند و بکلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایمان می آرند و معرفت و حال محمدی شنیدہ تعجب تمام می کنند۔[1]

ایک صوفی صافی کی طرح ان کے یہاں بھی کسی قسم کا تعصب و قومی و نسلی امتیاز نہ تھا۔ وہ اکبر کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"فقیر کجا و نصیحت کجا و حق آنست کہ اندیشہ رفاہیت خلق دامن گیر خاطر حکام باشد چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خداست و رسید ایں مقام کہ صاحب آں مقام بہر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم چناں کہ بیان یافتہ در فتوحات و وارد است در قرآن وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ بر سبیل عموم ست شمل رب العالمین۔ غائباً افاضۂ رحمت برکسے بحسب مرتبہ آں باشد۔[2]"

۱۰۔ رسالۂ غایت العبادات یا غایۃ الخواص (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری سبحان اللہ کلکشن نمبر ۲۹۷/۱۴۴) متوسط تقطیع اٹھائیس اوراق پر مشتمل ہے۔ ابتدا یوں ہے۔

"بعد از تحمید و توحید ذاتی کہ وصول ہر نعمت بانعام اوست و تمامی ہر کار بہ تقدیم نام او، و صلوٰۃ و تسلیم برحبیب خاص و برآل و اصحاب اہل اختصاص، می گوید فقیر محب اللہ مبارز چوں بعضے اخوان اہل صفا و ذابریں آمدند کہ بعضے مطالب اہل اللہ خاص بدو عالم و سبب ایجاد عالم کہ در تصانیف عارف و اصل و محقق کامل اندجہ حال بری شیخ محی الدین عربی ثبت یافتہ اند فقیر آں را جدا ساختہ در چند اوراق ثبت نماید بعزم قبول نمود کہ علاوہ حیلہ را راہ نبود۔

اس رسالہ کو پانچ ابواب پر منقسم کیا۔

"بنابرایں ترتیب ایں رسالہ بر پنج باب دل در بیان آں کہ مناظر اہل اللہ در حق حق عزّ عقاید اہل کلام و علماء رسوم است، باب دوم در بیان آں کہ دید و حال نقص است نہ کمال، باب سوم در بیان نسبت حق و اسماء و صفات، و باب چہارم در بیان سبب بدو عالم، باب پنجم در بیان بروز خلق روحانی و جسمانی۔"

۱۱۔ عبادات الخواص (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ فارسیہ مذہب ۱۹۳) چھوٹی تقطیع میں ایک سو ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ پندرہ تنبیہات، نو ابواب، پانچ سو چھتیس فصلوں اور ایک خاتمہ پر مبنی ہے۔ فصلوں میں جملہ تمام مسائل کا بیان شرح و بسط سے ہے۔

"پہلا باب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بیان میں، دوسرا جہنم، تیسرا جنت، چوتھا اصول فقہ، پانچواں طہارت، چھٹا نماز، ساتواں زکوٰۃ، آٹھواں روزہ اور نواں حج کے بیان میں ہے۔ خاتمہ میں نوافل، سنتوں اور فرضوں کا بیان ہے۔

کتاب کے اختتام پر لکھتے ہیں۔

"بداں کہ افتتاح و بدایت املاء ایں تالیف در بست و ہفتم شہر رمضان سنہ یکہزار و پنجاہ و یک واقع شدہ بود و در ہشتم ماہ محرم سنہ یکہزار و پنجاہ و دو فقیر بیمار شد و در اثناء ایں کتاب تعطل و تکاہل واقع شدہ در ہشتم ماہ شوال سنہ مذکورہ بر ایں آمد کہ تالیف را بہر تقدیر باتمام برساند اگر مشیت الٰہی توفیق حرکت بخشد قلم پس شروع نمود و در اتمام ایں تالیف و در یازدہم ماہ ربیع الاول سنہ ہزار و پنجاہ و سہ بعنایت ربانی و معونت سبحانی باتمام رسید، و للہ الحمد اولاً و آخراً۔"

آخر میں کاتب نے لکھا ہے۔

"تم الکتاب المستطاب المسمی بعبادات الخواص من مولفات القطب الربانی الغوث الصمدانی نادر العصر والزمان خاتم البیان والتبیان سید سیدی و سندی و شیخی شیخ محب اللہ حضرت شیخ محب اللہ

---

[1] مکتوبات: ۳۳۵ [2] مکتوبات: ۳۸۸ - ۳۸۹

مباولۃ پیر قدس سرہٗ

(۴) شرح فصوص الحکم (فارسی) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور معروف کتاب کی شرح ہے شاہ صاحب کی

تالیف ۲۰، ۱۰۴۳ کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ مکمل نسخہ حبیب گنج

گلگشت (ف ۲۱/۱۲۲) میں موجود ہے جو بڑی تقطیع میں سات سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا ناقص الطرفین

نسخہ ذخیرہ شیفتہ (۸۵/۲) میں موجود ہے۔ یہ شرح بہت جامع اور اپنی نظیر آپ ہے۔

شاہ غلام مصطفیٰ مہرونشدی اور محمد باقر الہ آبادی کے اردو ترجمہ مع فارسی متن کے ادارہ انیس اردو الہ آباد

سے ۱۹۶۷ء میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

(۵) مغالطہ عامہ۔ مسلم یونیورسٹی (یونیورسٹی عربیہ علوم ۱۳۰) میں اس کا ایک نادر نسخہ موجود ہے، جس کے اول و آخر میں

شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی مہریں ہیں۔ ابتدا میں مہر کے اوپر شاہ صاحب موصوف کی یہ تحریر ہے۔

ھذا الکتاب من متملکات احقر الانام اضعف العباد ابی الفضل ناصر

الدین محمد المشتہر باجمل الہ آبادی عفا اللہ تعالیٰ عنہ۔

متوسط تقطیع میں ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ الذی ھو الرحمن الذی علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان

مختلف مسائل کا بیان ہے۔ عوام میں پھیلے ہوئے غلط عقائد اور رجحانات کا تذکرہ ہے۔ حق تعالیٰ کی

رویت کا جواز، ولایت، نبوت، رسالت، اس طرح ایک سو ستر مغالطوں کا بیان ہے درمیان میں مختلف

فصلیں بھی ہیں ہر جگہ شیخ اکبر کے اقوال بطور استناد درج کئے ہیں۔

(۶) رسالہ ہفت احکام، مسلم یونیورسٹی (ف ۲۱/۵۵ فارسیہ تصوف) میں اس کا موجود نسخہ تیس صفحات پر

مشتمل ہے۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد لکھتے ہیں۔

می گوید فقیر حقیر محب اللہ غفرلہ و برکہ چوں او تعالیٰ مناظرہ و تصدیق ملاحظہ دلیاء کرند بے ازاں

مناظرہ کرد باشد قبل ازیں در مناظر اخص الخواص جبلی است بر معرفت ہفت مسائل ... حکم اول علم

بہ حقائق است، دوم علم بتجلی حق تعالیٰ در اشیاء، ثالث علم بخطاب حق تعالیٰ مر عباد را بالسنہ شرائع،

بکمال و نقص در وجود، خامس علم انسان بنفس خود از جہت حقائق آں، حکم سادس علم بخیال و عالم

آں، سابع علم بہ علل و ادویہ آں۔

احکام کے بیان سے پہلے حقائق و معارف پر مشتمل ایک مقدمہ بھی ہے۔

(۷) انفاس الخواص فصوص الحکم کی عربی شرح ہے۔ اسی انفاس پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قدیم نسخہ کتب خانہ

انوریہ کاکوری میں موجود ہے جو ۱۱۰۰ھ کا لکھا ہوا اور اصل نسخہ سے مقابلہ کیا ہوا ہے۔ رضا لائبریری رامپور (۲۹)

انڈیا آفس لائبریری (۱۲۷۹) خدابخش پٹنہ (۳۰۰۳) میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ الذی لا احد لما سواہ ولیس المختار الا ایاہ۔

اختتام پر یہ عبارت ہے۔

فمن لا یرا لا یدرا لانفقد عینی القلب فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب

التی فی الصدور وھذا اخر الکتاب وانہ لتذکرۃ للمتقین وانا لنعلم ان

منکم مکذبین وانہ لحسرۃ علی الکافرین وانہ لحق الیقین فسبح باسم ربک

العظیم قد وقع الفراغ من کتابہ ھذا الکتاب۔

(۸) مناظر اخص الخواص، یہ متوسط تقطیع میں تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جمادی الآخر ۱۱۰۳ھ

کا لکھا ہوا کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ف ۵۵/۳ شیفتہ گلگشت) میں بھی

اس کا ایک نسخہ ہے لیکن ناقص الطرفین ہے۔

(۹) التسویہ بین الافادہ والقبول، یہ شاہ صاحب کا سب سے مشہور و معروف رسالہ ہے حقائق و معارف

کے ایسے بیانات درج ہیں کہ بقول صاحب تصنیف شرح تسویہ۔

"واقعی عزت الاقدام عرفاست و اثر ابنجاست کہ بسیارے در پے انکار آں رفتہ و از بدعت بر شیخ تہمت بستہ[1]۔"

جب یہ رسالہ مشہور ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کی نظر سے گذرا تو بہت غصہ ہوا اور حکم دیا کہ شیخ کو حاضر کرو۔ لوگوں نے کہا کہ ان کی وفات ہوگئی البتہ ان کے مریدوں میں دو آدمی باقی ہیں ایک شاہ محمدی دوسرے ملا محمد قنوجی کہنے لگا کہ اگر ان میں سے کوئی اس رسالے کے مضامین کی مطابقت شرح سے کردے تو خیر ورنہ رسالہ جلا دیا جائے اور جس قدر ان کے مرید ہوں وہ بیعت توڑ دیں کیونکہ اس کے مطالب نہایت دشوار ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبرئیل الٰہی کے ساتھ تھے یا ہر پیغمبر کے جبرئیل نے ان سے اپنی زبان میں باتیں کیں۔ ملا محمد قنوجی منصب دار شاہی نے تو بیعت توڑ دی مگر شاہ محمدی نے جواب میں لکھا کہ بیعت اسلام سے ارتداد ممکن نہیں اور شیخ نے جس مقام سے گفتگو کی میری ابھی وہاں رسائی نہیں بروقت عروج ان مضامین کی مطابقت آیات و احادیث سے کردی جائے گی اور اگر اس رسالہ کو جلا دینے کا مصمم ارادہ ہے تو جس قدر اس کی نقلیں ملیں جلا دیں شاہی باورچی خانہ میں فقراء متوکل کے یہاں سے زیادہ آگ ہے۔ عالمگیر خاموش ہو رہا[2]۔

"ماثر الکرام کے مؤلف نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ

"دراں وقت کہ علمائے ظاہر بر رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ ہنگامہ برپا کردند و سلطان اورنگ زیب انار اللہ برہانہ را شورانیدند کہ ایں رسالہ سخنان مخالف شرع شریف دارد و سلطان حکم فرمودند کہ درویشان قلم رو پادشاہی را در عسکر سلطانی احضار نمایند و از مقالہ ہر کدام استعلام نمایند شیخ محمد افضل الہ آبادی قدس سرہ (۱۰۳۸ھ/۱۶۲۸ء، جمادی ۱۱۲۴ھ/۱۲، ۱۷ء) از رسالہ و ارادت اندیشیدند کہ در غلبہ حالات رقم زدہ کلک ارشاد گردیدہ ہر چند دل شیخ قدس سرہ نمی خواست کہ شہید لکن دراں ایام کہ آتش فتنہ سخت مشتعل بود نگاہداشتن ہم مصلحت نمی دیدند۔ لاجرم آب در نظر کاں

[1] تصفیہ شرح تسویہ مولانا حافظ شاہ قلندری کاکوری (مطبوعہ) ص ۶۳ ترجمہ رسالہ تصفیہ شرح تسویہ مطبوعہ ص ۴۰

چو ہیں بہ پر کردہ آں رسالہ چہار ورقی را انداختند کہ چوں کاغذ کالپی در آب زود متلاشی می گردد خود بخود محو خواہد شد۔ غرض شیخ ایں کہ بدست خود را از الہ خط سعی نہ کردہ باشد تمام شب در آب بود و در سفید سطرے محو نہ شدہ و صبح ایں حال مشاہدہ نمود بخاطر آوردند کہ مرتب حضرت سید قدس سرہ آں است کہ ایں رسالہ باشد خشک کردہ نگاہ داشتند شیخ محمد یحییٰ الہ آبادی قدس سرہ در کتاب اعلام الانام می گوید من آں رسالہ را بعینہا با رسائل و دیگر از تصانیف حضرت سید قدس سرہ یک جا جلد کردہ حرز جان و ایمان خود دارم[1]۔

راقم السطور کے علم میں رسالہ مذکورہ سے اختلاف کے باوجود ہندوستان میں اس کی درج ذیل شرحیں لکھی گئیں۔

(۱) شرح تسویہ مصنفہ محمدی فیاض زینی گجراتی شاگرد شاہ محب اللہ الہ آبادی (۲) شرح تسویہ مصنفہ شیخ امان اللہ بنارسی (۳) شرح تسویہ مؤلفہ شیخ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی دہلوی (۴) شرح تسویہ شیخ محمد افضل بن عبدالرحمن عباسی الہ آبادی (۵) تجلیہ شرح تسویہ بزبان عربی، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی بن مولانا امین اللہ انصاری والد بزرگوار مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۶) تسویۃ التسویہ میر غلام اکبر دہلوی فیض آبادی (۷) تصفیہ شرح تسویہ شرح فارسی مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی۔

موخر الذکر شرح تسویہ راقم سطور کے پیش نظر ہے اور حق یہ ہے کہ شاہ موصوف نے رسالہ تسویہ کی شرح و وضاحت کا حق ادا کر دیا۔ یہ شرح معہ فارسی متن اور اردو ترجمہ مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کاکوروی (خلف اوسط شارح) کے خانقاہ کاظمیہ سے شائع ہوئی ہے۔ راقم الحروف کو خوب یاد ہے کہ مشہور محقق و دانشور مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی جب خانقاہ کاظمیہ میں آئے تو دوسرے مخطوطات دیکھنے کے علاوہ اس شرح کے بارے میں استفسار کیا جس پر صاحب سجادہ حال کے فاضل و محقق برادر گرامی شاہ حافظ مجتبیٰ حیدر صاحب مدظلہ نے تصفیہ کا ایک نسخہ ہدیۃً پیش کیا جسے عرشی صاحب مرحوم نے بڑی مسرت اور شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے قبول کیا کہ شاہ صاحب میں نے ایسی عمدہ شرح تسویہ کی نہ دیکھی تھی۔ اس کا وہ نادر و نایاب نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے جو ۵ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کا بخط مؤلف ہے۔ گویا شاہ صاحب نے اپنی وفات سے بیس سال قبل لکھا تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہے۔

الحمد لمن وجد بکل ما وجد وسجد بکل ما سجد والصلوٰۃ والسلام علی خیر

[1] ماثر الکرام از میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۸۴-۸۵

من نطق به واصطفاه واتی لقوله تعالی اینما تولوا فثم وجه اللہ واجتباه

والہ خیر الآل واحسن المآل ....

پانچ اوراق پر مشتمل اس نسخہ میں اٹھارہ سطریں فی ورق ہیں۔ ہر سطر میں سات آٹھ الفاظ ہیں۔

آخر میں یہ عبارت ہے۔

قال اللہ تعالی وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتبعھم فرعون وجنوده

بغیا وعدوا ...

اس نسخہ میں دو ایک مقامات پر شاہ صاحب نے کچھ الفاظ قلم زد بھی کئے ہیں۔ رسالہ تسویہ کا ایک دوسرا نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری (عبدالحی فرنگی محلی کلکشن $\frac{1098}{4/4}$ عربیہ متفرقات) میں محفوظ ہے جو مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کا نقل کردہ ہے۔ اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

تمت رسالۃ التسویۃ بین الافادۃ والقبول من الشیخ محب اللہ الآبادی افاض اللہ علیہ الایادی بید الفقیر الی رحمۃ العلی الکریم محمد عبدالحلیم ابن المرحوم الملا محمد امین اللہ الانصاری نسبا اللکھنوی وطنا والحنفی مذہبا و القادری مشربا فی بلدۃ بمبئی حین رجوعہ من الحرمین الشریفین زادہما اللہ شرفا فی شہر المولد من ۱۲۶۷ھ

اس نسخہ میں کل سات اوراق ہیں، ہر صفحہ میں کل گیارہ سطریں ہیں۔ رسالہ تسویہ کا ایک فارسی ترجمہ مسلم یونیورسٹی (فارسیہ مذہب $\frac{43}{104}$) میں موجود ہے جو چھوٹی تقطیع میں ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے اور ۱۱۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس کی ابتدا یوں ہے۔

بدانکہ فقیر محب اللہ بعضے اخوان با صفا و ہلداں باوفا کہ در حل عبارت عربی محتاج بودند بہ سوئے ترجمہ فارسی خود را درقید آوردکہ "رسالہ تسویہ" با ترجمہ فارسی بہ نویسد۔

———— ✲ ————

باب التقریظ والانتقاد

اردو رسالوں کے خاص نمبر

روزنامہ قومی آواز اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر | مرتبہ جناب الحاج عزیز صاحب عزیزی سائز ۲۲×۱۸، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۴۴، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: قومی آواز ہیرالڈ ہاؤس بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی

اب چند برس سے اردو کا مشہور قدیم روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے علاوہ دہلی اور بعض شہروں سے بھی شائع ہو رہا ہے، یہ خاص نمبر نئی دہلی سے نکلنے والے قومی آواز نے شائع کیا ہے جو اردو کے اشاعتی اداروں اور طبع و اشاعت کے مسائل کے علاوہ اردو سے متعلق متنوع مضامین کا ذخیرہ اور کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اردو نشر و اشاعت سے متعلق تقریباً دو درجن مضامین درج ہیں، ان میں بہار، لکھنؤ، بمبئی، الہ آباد، علی گڑھ، حیدرآباد، کلکتہ، دہلی اور دیوبند میں اردو کتابوں کی طبع و اشاعت کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں اردو میں جینی، بدھ، سکھ اور ہندو مذہب کی کتابوں کا اور ایک میں اسلامی کتابوں کا تذکرہ ہے، آزادی کے بعد کے اردو کے علمی و ادبی رسائل اور ان کے اہم خاص نمبروں کے بارے میں بھی مضامین دیئے گئے ہیں، بچوں سے متعلق اردو لٹریچر کا ذکر بھی ایک مضمون میں ہے، اردو طباعت و صحافت، اردو کے ناشروں اور اردو کتابوں کی طبع و فروخت کے مسائل سے متعلق بھی اچھے مضامین درج ہیں، منظومات کا حصہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے، غزلوں میں میر و سودا سے اب تک کے غزل گو شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے، اور نظموں میں جوش اور ان کے بعد کے ترقی پسند شعرا کا کلام درج ہے، تیسرا حصہ وزن دار مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں موجودہ ادبی مسائل نئی شاعری کے نقاد، ادبی ڈرامے، اردو میں طنز و مزاح اور اردو کے نصابی مسائل وغیرہ کے زیر عنوان نامور اصحاب قلم کی نگارشات پیش کی گئی ہیں، اسی حصہ میں گوپی چند نارنگ نے اردو رسم خط کے بدیسی ہونے کی تردید کی ہے،

اور جگن ناتھ آزاد نے جواہر لال کے ادبی درجہ پر بحث کی ہے، ایک مضمون میں اردو کے محسن منشی نول کشور کا تذکرہ ہے، اور ایک مضمون میں انجمن ترقی اردو کی مختصر سرگذشت تحریر کی گئی ہے، اس کے بعد افسانوں کا حصہ بھی دلکش ہے، آخر میں اردو کے موجودہ مختلف اشاعتی اداروں اور مکتبوں کا مختصر تعارف، ان کی خصوصیات اور اہم خدمات بیان کی گئی ہیں، شروع میں بعض اداروں کے علاوہ مشاہیر شعر و ادب کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں اور جا بجا مختلف اداروں کی مطبوعات کی فہرستیں بھی درج ہیں، گو اس نمبر کے اکثر مضامین ماخوذ ہیں تاہم اس سے اردو کے موجودہ اہم اشاعتی اداروں کے متعلق مفید معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں اور یہ آزادی کے بعد اردو کی اشاعتی اور ادبی سرگرمیوں کی داستان بھی ہے۔

رفیق علمائے بہار نمبر: مرتبہ جناب محمود عالم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۷۶، قیمت سات روپے، سالانہ چندہ ۲۵ روپے، پتہ: دفتر رفیق سلطان گنج پٹنہ

ماہنامہ "رفیق" نیا مگر ہونہار رسالہ ہے، اس کے اس خاص نمبر میں بہار کے تقریباً پچاس متوفی علماء کا تذکرہ ہے، جو مختلف طبقہ و مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں اصحاب سلوک و عرفان بھی ہیں اور معقول و منقول کے جامع علماء بھی، مدرسین اور مصنفین بھی ہیں، اور فقہاء و محدثین بھی، اہل حدیث اور حنفی بھی ہیں اور جماعت اسلامی اور بریلوی بھی، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدین و خلفا بھی۔ حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مولانا شہباز، ملا محب اللہ، مولانا غلام یحییٰ، مولانا سید ولایت علی صادق پوری، مولانا ابو محمد ابراہیم آروی، مولانا سید میاں نذیر حسین، مولانا شوق نیموی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر حسن گیلانی جیسے ہندوستان بلکہ عالمگیر شہرت کے مالک، ناموں سے اس نمبر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، گو اکثر مضامین ماخوذ یا ملخص ہیں تاہم اتنے سب علماء کا یکجا تذکرہ شائع کرنا بھی کم اہم نہیں ہے۔

"ض"

ادبیات

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

بہارِ بزم کہاں لٹ گئی خدا جانے
سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے

وہ شوق کیا کہ جو شرح و بیاں کا ہو محتاج
وہ عشق کیا جسے تری نظر نہ پہچانے

اگر سنے تو اجل کا بھی رُخ بدل جائے
ابھی حیات نے چھیڑے نہیں وہ افسانے

ہر ایک چیز ہے منسوب اپنی فطرت سے
لباسِ شمع میں خود جل رہے ہیں پروانے

جلے سلوک سے طے ہو رہی ہے راہِ جنوں
یہ کون راہبرِ عشق ہے خدا جانے

وہ نامراد جہاں ہوں کہ ڈوبنے جو گیا
تو ڈال لی شکن اپنی جبیں پہ دریا نے

رضائے دوست میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں
وصال و ہجر کی شرطیں مری بلا جانے

ادب کی راہ میں ابھرا ہوں نقش کی صورت
یہ اور بات ہے دنیا ابھی نہ پہچانے

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ تشنہ لب جوہر
جدھر نگاہ اٹھا دیں ہزار میخانے

غزل

از جناب محمد حسین فطرت بھٹکلی، بھٹکل

نالۂ عندلیب یا زمزمۂ صبا نہیں
ذوقِ لطیف ہو اگر صحنِ چمن میں کیا نہیں

ترے جمودِ روح کی آج تو انتہا نہیں
قلب ہے اور خلش نہیں لب ہیں مگر نوا نہیں

چشم بصیر بند ہے، دیدۂ شوق وا نہیں
کونسی چیز میں بھلا جلوۂ کبریا نہیں

نقشِ جمالِ زندگی آج کہیں ملا نہیں
عشق میں وہ تڑپ نہیں حسن میں وہ حیا نہیں

غازۂ روئے ناز سے جلوۂ خوشنما نہیں
حسن لباس ہے عبث قلب جو پارسا نہیں

درد جو مستقل نہیں، درد جو لا دوا نہیں
مایۂ ناز ہو تو ہو مایۂ جانفزا نہیں

مطربِ نغمہ خواں نہ جا میرے لبِ خموش پر
جوشِ فغاں ہے قلب میں ساز یہ بے صدا نہیں

شائقِ حسنِ مادی فرق ہے اصل و نقل میں
ذوقِ نظر سے کام لے، رنگِ ہوس حنا نہیں

میری صدائے خونچکاں نوحۂ عرش گیر ہے
حرفِ فغانِ نیم شب نالۂ نارسا نہیں

کاوشِ اندمالِ دل سعیِ عبث ہے عشق میں
شائقِ عافیت، ترے درد کی کچھ دوا نہیں

باغ میں میرے سامنے زخمِ دلِ بہار ہے
دیدۂ اشتیاق میں غنچۂ نیم وا نہیں

نقش و نگارِ رنگ و بو کا ہے عبث حریص تو
شائقِ فصلِ نوبہار، عہدِ خزاں میں کیا نہیں

ایک خدا سے مجھکو سدا ہے واسطہ
فطرتِ بے نیاز کو خلق سے کچھ گلا نہیں

غزل

از ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

کسی کا غم بٹانے کی کسی کی جاں بچانے کی
خدا توفیق دے مجھ کو کسی کے کام آنے کی

وفورِ غم سے اپنا حال دل تو کہہ نہیں پاتا
کہاں سے لاؤں ہمت دوستو نغمے سنانے کی

اسے گلشن سمجھنا دوستو توہینِ گلشن ہے
اجازت خاص پھولوں کو جہاں ہو مسکرانے کی

جہاں اہلِ چمن پیروں سے اسکو روند دیتے ہیں
اگر سبزے نے کوشش کی ذرا بھی لہلہانے کی

جہاں پابندیاں عائد ہیں پھلنے پھولنے پر بھی
وہ ٹہنیوں کو اجازت تک نہیں ہے سر اٹھانے کی

رہیں کیسے بھلا سرو و صنوبر مطمئن ہو کر
کہ ہوتی رہتی ہیں جب سازشیں ان کو جلانے کی

کوئی شے بھی نہیں محفوظ گلچینوں کے ہاتھوں سے
نہ عزت لالہ و گل کی نہ عظمت آشیانے کی

بایں حالِ پریشاں میں کہوں کیسے طفیل آخر
بھری ہیں آج میرے دل میں خوشیاں کل زمانے کی

مطبوعات جدیدہ

خلافت عباسیہ اور ہندوستان ۔ مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۵۸، قیمت مجلد ۳۸ روپے، غیر مجلد ۳۰ روپے، پتہ:۔ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

اسلام کے ابتدائی دور میں عرب و ہند کے تعلقات مصنف کا خاص موضوع ہے، اور اس پر ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور (۱۳۲ھ تا ۲۳۲ھ) کے دونوں ملکوں کے تعلقات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جو پہلے عباسی خلیفہ سفاح سے متوکل کے زمانہ کو محیط ہے، اس دور میں سندھ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے خلفائے عباسیہ کے زیر نگیں تھے، اور انہی کی جانب سے یہاں امرا مقرر ہوتے تھے، جو ان کی نیابت کرتے تھے، اس کے بعد یہاں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں جو عباسی خلافت کے ماتحت نہ تھیں، مصنف نے اسی ابتدائی اور زریں دور کے جو تقریباً ۱۰۰ برس پر مشتمل ہے، دونوں ملکوں کے تعلقات کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، سندھ اور اس کے نواح کے علاوہ جن علاقوں میں ہندوستانی راجا حکومت کرتے تھے، ان سے بھی خلافت عباسیہ کے یک گونہ تعلقات دکھائے گئے ہیں، اموی دور میں ہندوستان کے جو علاقے فتح ہو چکے تھے، عباسی دور میں ان پر کوئی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ساری قوت ان علاقوں میں بغاوت و سرکشی ختم کرنے اور خود عربوں کی قبائلی عصبیت فرو کرنے میں صرف ہوئی، گویا عباسی حکومت کا زریں دور مدافعت میں گزرا، اور بعد میں جب وہ اضمحلال و انتشار سے دوچار ہوئی تو عرب امرا نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں، اور عملاً یہاں سے عباسی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، مصنف نے اس کتاب میں پہلے یہاں کے سیاسی حالات اور ان فوجی اقدامات کی تفصیل قلمبند کی ہے، جو سرکشی و سرتابی کرنے والوں کے ساتھ کی گئی، اس سلسلہ میں ان امرا کی امارت اور ان کی خدمات کا ذکر بھی ہے، جن کو عباسی خلفاء نے مقرر کیا تھا، اسی ضمن میں عباسی خلفا اور ہندوستان

کے درمیان خط وکتابت اور ہدایا وتحائف کے مبادلہ کا تذکرہ بھی ہے، ایک علٰحدہ باب میں عباسی خلافت کی امارت بحر بصرہ پر بحث کی ہے، جو عباسی حکومت کی خاص ایجاد ہے، اور جس کا مقصد ہندوستان کے سرحدی اور سمندری علاقوں کی غارت گری وغیرہ کا استیصال تھا، اس باب میں اس امارت پر جو لوگ فائز ہوئے ان کا اور ان کی جنگی مہم کا حال بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد مختلف خلفاء کے عہد میں ان علاقوں میں جو امراء مقرر کئے گئے، ان کا نام تحریر کرکے ان کے قبائل کے متعلق معلومات پیش کئے گئے ہیں، پھر ان کے نظم ونسق، علم وادب نوازی، محاصل وآمدنی، مذہبی آزادی ورواداری، غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ، عدل وانصاف اور تعمیری کارناموں کا ذکر ہے، ایک باب میں اس دور میں عرب وہند کے تعلقات دکھائے ہیں، اس سلسلہ میں مسلمانوں سے ہندوؤں کی عقیدت ومحبت اور مسلمانوں کے ان کے بارہ میں اچھے تاثرات وخیالات کے علاوہ ان کے علوم وفنون سے دلچسپی ان کے معاملہ میں امن وانصاف پسندی، ان کے حسن وجمال کی تعریف اور ان سے شادی بیاہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، ایک باب دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات کے لئے مخصوص ہے، اس میں ہندوستان میں درآمد ہونے والی اور یہاں سے برآمد کی جانے والی چیزوں کا ذکر ہے، نیز مسلمان تاجروں کی ایمانداری اور سچائی اور اسکے اچھے اثرات اور ہندوستان کے لوگوں کی تجارت میں مہارت دکھائی ہے، اس کے بعد کے باب میں ہندوستانی علوم وفنون حساب، ہندسہ، نجوم وفلکیات، طب، قصص، اساطیر، نغمہ، موسیقی، جنگ اور جنگی آلات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا حال اور ہندوستانی کتابوں کے عربی ترجمہ واشاعت کا ذکر کیا ہے، پھر اس دور کے علماء اور اسلامی فنون کے ان ماہرین کا تذکرہ ہے، جو سندھ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، یا جنھوں نے باہر سے آکر یہیں بود وباش اختیار کرلی تھی، لائق مصنف نے ان حضرات کے تعلیمی سفر، درس وافادہ، روایت حدیث، تصنیف وتالیف اور ان کے متعلق اس زمانہ کی اسلامی دنیا کے اہل علم کی رائیں بھی نقل کی ہیں نیز حدیث، فقہ، تفسیر، قرأت، قضا اور زہد وتصوف وغیرہ میں ان کے امتیازات بھی دکھائے ہیں، آخر میں ہند سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم موالی وممالیک کی علمی خدمات اور مختلف فنون میں ان کی جامعیت کا تذکرہ کیا ہے، پوری کتاب

بڑی تحقیق ومحنت سے لکھی گئی ہے، اور مصنف نے دانہ دانہ چن کر یہ علمی خرمن تیار کیا ہے، ان کے خیال میں عہدِ فاروقی سے عہد عباسی یعنی تقریباً چار سو برس تک ہندوستان کے اسلامی مقبوضہ پر جو نظام جاری رہا وہ مجموعی طور سے خالص اسلامی نظام حکومت تھا، اس کتاب میں اسی نظام حکومت کی کیفیت اور اس دور کے خیر وبرکت اور اس کی تابانی ودرخشانی کی داستان سنائی گئی ہے، اور بنوعباس کے سیاسی، فوجی، علمی، تمدنی اور انتظامی کارناموں کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اور دونوں ملکوں اور ان کی تہذیبوں کے امتزاج سے جو اسلامی ہندی تہذیب وجود میں آئی اور مختلف شعبوں میں جو ترقی ووسعت ہوئی اور جو خوشگوار تعلقات اور باہمی اعتماد ومحبت کی فضا رونما ہوئی، ان سب کے متعلق مستند معلومات جمع کئے گئے ہیں، البتہ کتاب میں کہیں کہیں تکرار اور کتابت وطباعت کی غلطیاں ہیں، ایک جگہ بعض صفحے غلط لگ گئے ہیں، بعض جگہ عربی کے نامانوس اور اردو میں کم استعمال ہونے والے الفاظ اور جمع لکھے گئے ہیں

قانون کا حقیقی تصور اور انسانی آزادی: از مولانا جمیل الدین احمد مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۲۴۰، قیمت بارہ روپئے پتہ: (۱) سید اصغر علی کاظمی، بازار روپ لال شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد (۲) مینار بک ڈپو گلزار حوض، حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں قانون اور انسانی آزادی کے تصور پر بحث کی گئی ہے اور ازدواج کے بارہ میں اسلامی قانون کی موزونیت اور جہاد فی سبیل اللہ کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے، پہلے قانون کا مفہوم واضح کیا ہے اور اس کی تردید کی ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے، مصنف نے اس پر خصوصیت سے زور دیا ہے کہ قانون سازی صرف خدا کا حق ہے، پھر مختلف حیثیتوں سے الٰہی وانسانی قانون کا مقابلہ کرکے اول الذکر کی بالاتری اور مناسبت دکھائی ہے، اور موخر الذکر کا غیر مناسب اور فساد فی الارض کا موجب ہونا ثابت کیا ہے، انھوں نے بقائے حیات کے قانون، لباس، طعام اور ازدواج کے متعلق ہدایات الٰہی

کو انسانی فطرت کا عین اقتضا بتاتے ہوئے اس بارہ میں انسانی قانون خصوصاً یورپ کی بے راہ روی ثابت کی ہے، اور صالح تمدن و معاشرت کے لئے خدا کی بندگی اور غیروں کی محکومی سے آزادی کو بھی انسان کا فطری جذبہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس بارہ میں بے اعتدالی تمدن میں فساد اور انسانی زندگی میں انتشار کا باعث ہوتی ہے جس کے انسداد اور نوع انسانی کی خدمت و فلاح کے لئے اسلام نے جنگ کا حکم دیا ہے، انھوں نے جہاد اور اسلامی حدود و تعزیرات کو وحشیانہ قانون بتانے والوں کی مدلل تردید کی ہے، آگے چل کر آزادی کا مفہوم واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بے قیدی کے بجائے انسان کی پیدائش کے اصلی مقصد خدا کی عبادت اور خلق کی خدمت کی تکمیل کرتی ہے، اس سلسلہ میں مساوات کے اسلامی تصور اور مختلف مذاہب خصوصاً ہندو مذہب میں اس کے یکسر مفقود ہونے کا ذکر کیا ہے اور اسلام نے غلامی کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں اور غلاموں سے حسن سلوک کی جو تعلیم دی ہے اسے پیش کیا ہے، کتاب مفید مباحث پر مشتمل ہے، اور مصنف کا نقطہ نظر بھی درست ہے، مگر ترتیب کی خامی کی بنا پر مختلف مباحث ایک دوسرے سے مخلوط ہو گئے ہیں اور جا بجا بے ربطی اور کہیں کہیں اطناب اور زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں، شروع میں کتاب اور مصنف کے تعارف کے تعلق سے جو تحریریں درج ہیں ان میں بھی ناہمواری اور زبان و بیان کی غلطیاں ہیں۔

ردالاشراک: تالیف مولانا محمد اسماعیل دہلویؒ، ترتیب مولوی محمد عزیز شمس صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۴، قیمت درج نہیں، پتہ:۔ المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان۔

یہ مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ کی عربی تصنیف ہے جو ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے، اس کے پہلے باب کا خود مولانا نے اردو ترجمہ مزید وضاحت و تشریح کے ساتھ تقویۃ الایمان کے نام سے کیا تھا اور دوسرے باب کا ترجمہ ان کے انتقال کے بعد ان کے تلمیذ مولانا محمد سلطان نے تذکیر الاخوان کے نام سے

کیا تھا، یہ دونوں کتابیں خصوصاً اول الذکر بہت مقبول ہوئی، اور اس کے متعدد ایڈیشن نکلے، مگر اصل کتاب ناپید تھی، جامعہ سلفیہ بنارس کے نوجوان فاضل مولوی محمد عزیز شمس علم و مطالعہ کے حریص بھی ہیں، اور نادر و نایاب کتابوں کی تلاش و جستجو ان کا محبوب مشغلہ بھی ہے، اب انھوں نے اس کتاب کے کئی مخطوطات کا پتہ لگا کر ان کی مدد سے اس کا محقق متن اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، پہلے باب میں شرک کی مختلف قسموں جیسے علم، تصرف، عبادت اور عادات و اطوار وغیرہ میں خدا کا شریک بنانے کی تردید ہے، دوسرے باب میں پہلے اتباع سنت و اجتناب بدعت کے وجوب، ایمان کی حقیقت اور صحابہ کرام کے فضائل کا ذکر ہے، پھر قبروں پر کی جانے والی اور تقلیداً رواج پانے والی بدعات کی تردید کی ہے اور آخر میں مختلف رسموں گانا، بجانا، حسب و نسب پر فخر، تعظیم میں حد اعتدال سے تجاوز، شادی بیاہ میں فضول خرچی، مہر کی کثرت، نکاح بیوگان سے پرہیز، نوحہ، سوگ، زیب و زینت میں افراط، کفار کی مشابہت، مردوں کا عورتوں کا اور عورتوں کا مردوں کا لباس اختیار کرنا، ممنوع لباس استعمال کرنا، تصویر سازی اور گودنا وغیرہ کا ذکر ہے، مولانا نے ان امور کے متعلق محض آیات قرآنی اور احادیث نبوی جمع کر دینے پر اکتفا کیا ہے، اور ان کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی ہے، مرتب نے بھی صرف متن شائع کیا ہے اور حاشیے میں آیتوں اور حدیثوں کی تخریج کر دی ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں، اور مقدمہ میں اس کتاب کی اہمیت اور ان مخطوطات کے بارہ میں معلومات دیئے ہیں جن کا انھیں علم ہوسکا ہے، اس نایاب کتاب کی اشاعت قابل تحسین ہے۔

سبزہ و گل: مرتبہ جناب رئیس الدین فریدی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۶، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۱۶ روپے، ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۱۷، سندری موہن ایونیو، کلکتہ۔

جناب رئیس الدین فریدی مدیر روزنامہ ہند کلکتہ مشاق اور تجربہ کار صحافی ہیں، وہ کلکتہ کے علاوہ

بمبئی، حیدرآباد اور دہلی کے مختلف اخباروں سے بھی وابستہ رہے، انھیں صحافت اور نثر نگاری کے
علاوہ شعر و سخن کا اچھا ذوق بھی ہے، سبزہ و گل ان کی ادبی و شعری زندگی کی سرگذشت اور ان کے کلام
کا انتخاب ہے، اس کے پہلے حصہ میں انھوں نے اپنی شاعری کی داستان بیان کی ہے اور مختلف جگہوں کے
حالات و مشاہدات تحریر کیے ہیں، ان کا وطن امروہہ ہے، مگر ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بمبئی اور کلکتہ میں
بسر ہوا، اور انھوں نے دہلی، حیدرآباد اور جلپور میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا، اس کتاب میں ان سب
جگہوں کی ادبی شخصیتوں اور انجمنوں کا بہت دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے، شروع میں نظم و نثر کا
موازنہ اس طرح کیا ہے کہ دونوں ہی کی اہمیت و ضرورت تسلیم کی ہے، اس ضمن میں موسیقی اور رقص و
مصوری سے اپنی دلچسپی کا ذکر بھی انشراح کے ساتھ کیا ہے، پھر اپنی شاعری میں موروثی اور ماحول کے اثرات
اور امروہہ کی ادبی اہمیت دکھائی ہے، اور جلپور میں ابتدائی تعلیم، وہاں کے شاعرانہ ماحول اور اپنی شعر
گوئی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد بمبئی جانے اور صحافت کے پیشہ سے وابستگی اور وہاں کی ادبی و
شعری مجلسوں اور ان میں شریک مقامی و بیرونی اصحاب ذوق کا مزہ لیکر تذکرہ کیا ہے اور ان سے
اپنے رد الوداع کا [illegible] بھی بیان کیا ہے، پھر حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں اور وہاں کے شعرا و احباب کا تذکرہ ہے،
دلی میں مولوی عبداللہ مرحوم کے کتب خانہ عزیزیہ اور وہاں حاضر ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کا بھی
دلچسپ ذکر ہے، آخر میں کلکتہ کے مختلف مشاعروں اور اہم شخصیتوں کے بارہ میں تاثرات قلمبند کئے گئے
ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب مصنف کی سرگذشت بھی ہے، اور اس سے مختلف ارباب شعر و سخن کے بارہ
میں دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، دوسرے حصہ میں نظموں اور غزلوں کا سنہ وار انتخاب
دیا ہے، اس سے ان دونوں اصناف پر ان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے، لائق مصنف نے اپنے مشاہدات
و تجربات بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں اپنی بے لاگ رائے بھی تحریر کی ہے، مثلاً غزل کو وہ لاجواب صنف
سمجھتے ہیں (ص۲۷) مگر جدیدیت کو اپنی سمجھ سے بالاتر بتاتے ہیں (ص۱۲۸) دہلی کی شاعری کے وہ

بڑے مداح ہیں، اور لکھنؤ میں آتش کے سوا کسی کو چوٹی کا شاعر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ان کا رنگ
بھی خالص دہلوی ہے اور یہی حال حسرت کا بھی ہے (ص۱۰۱) جگر کے وہ پرستار ہیں (ص۱۱۶) مگر جوش
کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں (ص۲۱) غالب کی عظمت پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود ذوق
کو ان پر ترجیح دیتے ہیں (ص۵۵) مصحفی کو قدرت زبان اور صفائی محاورہ و بیان اور لطافت و
نفاستِ مضامین کے اعتبار سے میر و سودا سے بھی ممتاز قرار دیتے ہیں (ص۳۰) ان کی یہ رائیں
دوسروں کے لئے موضوع بحث ہو سکتی ہیں، خصوصاً اقبال کے متعلق جو یہ تحریر کیا ہے کہ "......
انسانوں میں عقائد کی بنا پر تفریق پیدا کی اور عظمت انسان کو اپنے ذاتی خیالات میں محدود کر کے
ڈال دیا" (ص۵۹) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا دقت نظر سے مطالعہ نہیں کیا ہے،
ایک جگہ انھوں نے مشاعروں میں سامعین کی ہڑبونگ کا ذکر کر کے اس کی ملک گیر پیمانہ پر اصلاح
کی ضرورت ظاہر کی ہے مگر شعرا کی بے راہ روی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی ہے،
مگر مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ قابل اصلاح ہیں "اپنے احساسات سے دوسروں
کو اطلاع دے سکتا ہے"، (ص۱) "مگر اقبال کے متعلق میرا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ انھوں نے رومی کا چیلا
ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود...." (ص۵۹) ایک مصرعہ میں قوم کو مذکر باندھا ہے (ص۱۸۹) جو غلط ہے،
ذیل کے مصرعہ میں ؎ "جس میں ہمسوں کو میسر نہ غذا ہے نہ دوا" (ص۱۹۰) ہمسوں کھٹکتا ہے،

سمندر پھر بلاتا ہے : از جناب عرفی آفاقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت
و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت: ۲۰ روپے پتے
(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، (۲) یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱،

یہ جناب عرفی آفاقی کا پہلا شعری مجموعہ ہے، اس میں ۵۹ء سے ۸۱ء تک کا منتخب کلام شامل ہے،
انھوں نے اسے دلکش پیرایہ میں اہلِ زمانہ کے نام منسوب کیا ہے، اس کے بعد خدا کے حضور میں دو شعر

نذر کئے ہیں، پھر اپنا ایک خاص انداز میں تعارف کرایا ہے، انتخاب کے شعروں کے لئے اقبالؔ اور تعارف کے لئے غالبؔ کی زمینیں منتخب کی ہیں، جو ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے، یہ مجموعہ نظموں، غزلوں، قطعات، متفرق اشعار، دوہے اور ڈوہٹے (گیت)، متنوع اصناف سخن پر مشتمل ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ جاندار ہے، ان میں جا بجا جدت و تازگی کے نمونے ملتے ہیں، مصنف نے عموماً نئی اور مشکل زمینوں میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے، ان کی جدید شاعری پر بھی نظر ہے اور انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس لئے ان کے کلام میں دونوں کا حسین امتزاج ہے، اور وہ موجودہ دور کا عکاس بھی ہے، ان کے یہاں نئے الفاظ و استعاروں، نئی ترکیبوں و تشبیہوں اور جدید علامتوں اور رموز کے ساتھ ہندی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں، کلام کے دوسرے حصے بھی قابل توجہ ہیں، نظموں سے ان کی قدرت کلام، احساسات کی شدت اور مشاہدے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، ان میں طویل، مختصر، آزاد اور پابند ہر طرح کی نظمیں ہیں، اردو میں اب دوہے کہنے کا رواج بڑھ رہا ہے، عرفی صاحب نے اس میں بھی نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی شاعری فکری گہرائی و معنویت کی حامل ہے جس میں لب و لہجہ کی جدت نے ایک مخصوص کیفیت پیدا کر دی ہے، کتاب ظاہری حیثیت سے بھی دیدہ زیب ہے۔

فیوضات وزیریہ: مرتبہ مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ وزیریہ، محلہ انگوری باغ رامپور۔ یوپی۔

رامپور کے صوفی مولانا وجیہ الدین احمد خاں کے ملفوظات کو ان کے نواسے مولوی وجاہت اللہ خاں صاحب نے قلمبند کیا ہے اور مصنف کے مرشد مولانا وزیر محمد خاں مرحوم کے نام پر اس کا نام فیوضات وزیریہ رکھا ہے، اس میں تصوف کے اشغال و اعمال اور اوراد و وظائف کے علاوہ سلسلہ قادریہ مجددیہ جمالیہ کے ختمہائے معمولہ اور اس سلسلہ کے منظوم و منثور شجرے بیان کئے ہیں، شروع میں مصنف کے اور آخر میں ان کے شیخ کے حالات درج ہیں، اس میں اسلامی تصوف کے ساتھ مروجہ تصوف کی بھی بہت سی باتوں کا ذکر اور دیوبندیت و وہابیت پر چھینٹے بھی ہیں، اس سے مصنف کے خیال و مسلک کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب غیر مستند واقعات اور صوفیانہ شطحیات سے بھی خالی نہیں ہے، مثلاً ص ۹۰ پر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا جو الہام نقل کیا ہے وہ اخبار الاخیار میں شیخ کے تذکرہ میں نہیں ملا۔

"ع۔ ص"

جلد ۱۳۴ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۴ء عدد ۳

مضامین

ایک ضروری اطلاع

کاغذ کی ہوش رُبا گرانی کی وجہ سے دار المصنفین کی مطبوعات کی قیمت میں یکم اکتوبر ۸۳ء سے بیس فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور معارف کا سالانہ چندہ بھی جنوری ۸۴ء سے ہندوستان کے لئے تیس روپئے اور بیرون ہند کے لئے ساٹھ روپیے کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ دار المصنفین اور معارف کے قدر داں اس معمولی اضافہ کو بطیبِ خاطر گوارا کریں گے۔

منیجر